ابوالکلام آزاد
کا
ذہنی سفر

ظ۔ انصاری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر

ظ۔ انصاری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

Abul Kalam Azad Ka Zehni Safar
by
Zoe-Ansari
Rs.70/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/70

ISBN :978-81-7587-799-3 سلسلہ مطبوعات: 1628

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: میکاف پرنٹرس، 2847، بلبلی خانہ، ترکمان گیٹ، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہوگیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرنظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

فہرست

ابوالکلام اور ہم

۱۹۵۵ء کے آتے یا جاتے جاڑوں میں، اپنے وقت کے بے باک صحافی اور صاحبِ طرز انشاپرداز قاضی عبد الغفار دلّی کی ایک محفل سے اٹھنے لگے تو اپنا اُوَرکوٹ میری کلائی پر رکھا اور کہا، چلیے، گھر چلتے ہیں۔ سنتے ہی جی خوش ہوگیا۔ دلّی میں اُن کا گھر مولانا ابوالکلام آزاد (وزیرِ تعلیم) کی کوٹھی تھی۔ کار بھی اُسی بنگلے کی۔ سہ پہر کا وقت پہنچے تو مولانا کی خاص نشان بردار کار باہر نکل رہی تھی۔ اب وہاں ملازمین کے سوا کوئی نہ تھا اور صاحبِ خانہ کی موجودگی میں جو سناٹا رہا کرتا تھا، خادموں کی چہل پہل نے اُس کی یکسانی گویا انتقاماً توڑ دی تھی۔

قاضی صاحب مرحوم ہلکے موڈ میں تھے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا کا مکان اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ توقف کے بعد وہ گھمانے لے چلے۔ میں نے ایک کمرے کا بھاری دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا۔ یہ مولانا کی خلوتِ خاص تھی۔ بستر ایک طرف۔ صوفے دوسری طرف۔ پانی کا بلوریں جگ اور گلاس ایش ٹرے کئی چھوٹی بڑی میزیں۔ بکھراو میں ایک سلیقہ۔ جا بجا کتابیں اُلٹی سیدھی رکھی تھیں۔ بعض ایسے پیکٹ تھے جو شاید اُسی دن موصول ہوئے اور کھول کر اوپر تلے رکھ دیے گئے۔ قاضی صاحب رکتے رہ گئے، میں نے لپک کر ادھ کھلی کتابوں کے ٹائیٹل پڑھے۔ اُلٹی رکھی ہوئی کتابوں کو سیدھا کر کے دیکھا اور پھر وہیں جوں کا توں رکھ دیا۔ مولانا ابوالکلام کا یہ روپ تب تک دیکھا نہ تھا۔

عِلم عِلم کی تصانیف چُنی ہوئی تھیں۔ کسی کے دس بارہ ورق پڑھے گئے، کسی میں یاد داشتوں کی چِٹ لگی ہوئی۔ کوئی پُرانی کتاب تازہ ترین مگر ہم موضوع تصنیف کی پیٹھ سے لگی کھڑی تھی، یعنی ظاہراً ابھی دو چار دن میں اس کی ورق گردانی کی گئی ہے۔ موضوعات ایسے کہ بعض کی تو ہمیں ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ ابنِ رشیق کی کتاب " العمدہ" ہے تو وہیں GOLDEN TREASURY موجود۔ اور خُدا جانے، کیا کیا۔ ۳۳ برس اُس شام کو گزر گئے، آج تک یاد ہے کہ GENETICS کے تعلق سے کوئی تصنیف میز پر رکھی تھی اور R.N.A. D.N.A. کے حرف میں نے پہلی بار اسی پر دیکھے۔ دل نے کہا: یہ ہے ہمارے زمانے کا مولوی۔ اس سے علم کی تشنگی سیکھنی چاہیے۔ اور کس درجہ وسعت!

دس بیس منٹ بعد میں بادلِ ناخواستہ اس محفلِ خاموش سے نکلا اور جو چیز جہاں تھی، جیسے تھی، رکھ آیا۔ کمرے کا یہی دروازہ تھا جہاں کبھی سرِ شام پنڈت جواہر لال نہرو دستک دیتے:

"مولانا صاحب میں حاضر ہوں!" (ص ۱۸۰ مقالہ صلاح الدین، مجموعہ مقالات زیرِ تبصرہ)

ان کے ایک سکریٹری **مرزا مسعود بیگ** کہتے ہیں:

"..... مولانا صاحب کی نظر میں پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے جو محبت میں نے دیکھی تھی وہ مولانا صاحب کے یہاں اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے لیے بھی نہیں تھی ...." (وہیں)

میں نے خود بھی اس محبت اور احترام کی بعض جھلکیاں دیکھی ہیں۔ نکیتا سرگئے یُرخ خروشچیوف اور مارشل بلگانن نومبر ۵۵ء میں دہلی آئے۔ اس سے ذرا آگے پیچھے سلطان ابن سعود آئے تھے۔ دونوں موقعوں پر حیدر آباد ہاؤس میں سرکاری استقبالیہ کا اہتمام ہوا۔ مغرب کا وقت نکل گیا۔ مولانا بے قرار تھے، چہل قدمی کرنے لگے۔ پنڈت جی ان کی پریشانی بھانپ گئے (اور قریب جاکر غالباً) معذرت سے تسکین دی۔ مسعود بیگ نے بیان کیا ہے:

"...... مولانا کو جس سے محبّت ہوتی تھی وہ ان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی اور ایسی محبّت میں نے صرف پنڈت جی کے لیے دیکھی۔ مجھے خوب یاد ہے جب مولانا صاحب یوروپ کے دورے سے دو ماہ بعد واپس لوٹے تو پنڈت جی انھیں خوش آمدید کہنے ائرپورٹ تشریف لائے تھے انھیں دیکھ کر مولانا صاحب کچھ تیزی سے جہاز سے اُترے ..... نیچے اُتر کر انھوں نے پنڈت جی سے جس گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور جس محبّت بھرے لہجہ میں بات کی اس طرح کی نگاہ اور محبّت میں نے کبھی کسی اور کے لیے مولانا میں نہیں دیکھی .....۔" (وہیں)

بے اختیار جی چاہتا ہے کہ یہیں اپنا ایک تبصراتی اقتباس دُہرا دوں، جو آج سے کوئی چودہ پندرہ سال پہلے ("بلٹز" اردو میں) چھپا تھا:

"....... ۱۰ر فروری ۱۹۵۸ کا دن ..... دلّی کی جامع مسجد کے نزدیک میدان میں آل انڈیا اردو کانفرنس کا جلسۂ عام ہوا تھا۔ مولانا نے آخری تقریر کی تھی۔ میدان بھر چکا تھا۔ جواہرلال آچکے تھے۔ سیکورٹی کا زبردست انتظام تھا۔ میں وہاں ذرا دیر سے پہنچا تو کہیں جگہ نہ رہی تھی۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا سطحِ آب پر کائی

.... مولانا دیر سے آئے۔ اسٹیج پر ذرا کھلبلی سی ہوئی۔ فوراً جواہرلال سروقد کھڑے ہوگئے۔ جگہ بنانے لگے۔ مولانا کا ہاتھ تھاما۔ آگے لائے۔ بٹھایا اور خود اپنا گھٹنا سکوڑ کر ذرا دب کر بیٹھ گئے۔ اسے نہرو کہتے ہیں۔ ـــــ اور اسے ابوالکلام بھی کہتے ہیں .....۔"

(ص ۱۱ "کتاب شناسی"، مطبوعہ بمبئی)

مولانا نے اپنی تصنیف "ہماری آزادی" INDIA WINS FREEDOM میں بھی پنڈت جی

کے نام معنون کی ہے ۔۔۔ جسے آج کل دونوں ہستیوں کے خلاف عموماً استعمال کیا جارہا ہے اور خوب سوچ سمجھ کر۔ دراصل دونوں کے درمیان جو گہری رفاقت کا رشتہ تھا اس کی بنیاد ذہنی تھی۔ دونوں جُدا جُدا ماحول اور ذاتی تجربات کی راہ سے آئے ایک آزمایش گاہ میں اُترے تھے اور پھر آزادانہ تجربوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں ہمنوا ہو جاتے تھے۔

مولانا نے تقلیدی عقائد کے خلاف جا بجا اپنی ذہنی آزادی کا تذکرہ کیا ہے۔ جواہر لال نے "میری کہانی" اور "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں تقریباً اُنھی تاثرات کا بیان کیا ہے:

"...... انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کر دیتے ہیں ..... بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اسے ڈھیلا نہیں کر سکتا۔"

(مولانا بحوالہ انشائیاتِ عابد حسین، ص۱۸۷)

"...... دراصل گاندھی جی تحریک کے مذہبی اور روحانی پہلو پر برابر زور دیتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب کسی اِدعائی عقیدے کا نام نہیں تھا۔ مگر وہ ایک مذہبی تصوّرحیات کے قائل تھے جس کا تمام تحریک پر زبردست اثر پڑا اور عوام کے لیے احیائے ماضی کی تحریک بن گئی ..... بعض اوقات میں پریشان ہو جاتا تھا کہ ہماری سیاست میں ہندو مسلمان دونوں کے ہاں مذہب کا دخل کیوں ہے۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ مولوی۔ مولانا۔ سوامی جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ مجھے ان کی تاریخ عمرانیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی ....."

(پنڈت جی۔ وہیں ص۱۹۸)

اس پہلو سے دیکھیے تو ایک روشن خیال مذہبی مولوی، اپنے ذہنی اُفق کی بڑھتی

ہوئی وسعت کے ساتھ عملی طور پر انھیں نتیجوں کو اپنا لیتا ہے جنھیں ایک مُشکِک (AGNOSTIC) مغربی علم و تمدن کا پروردہ ، جدید خیالات کا حامی پنڈت اپنا چکا ہے۔ مقصد کی یگانگی عمل کی ہم آہنگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تشدد اور عدم تشدد (ہنسا اہنسا) کے اہم مسئلے پر مولانا اور پنڈت جی اس بنا پر تقریباً ہم خیال تھے۔

"...... عدم تشدد کے اصول پر نہ کبھی میں پورا ایمان لایا اور نہ مستقل طور پر اسے تسلیم کیا لیکن میں اس کی طرف روز بہ روز کھینچتا جاتا تھا اور میرے دل میں یہ خیال بیٹھتا جاتا تھا کہ اس وقت ہندستان میں ہماری حالتِ زار اور ہمارے عقائد و روایات کے لحاظ سے یہ بہترین حکمتِ عملی ہے ....."

(پنڈت جی۔ وہیں۔ ص ۱۹۹)

اور مولانا نے ایک بار سے زیادہ اپنا یہ عقیدہ جتایا ہے، زبانی بھی تحریری بھی :

"....... مہاتما گاندھی کی روش سے ہٹ کر، میرا عقیدہ یہ نہیں کہ مُسلّح طاقت کا مقابلہ کسی حالت میں مُسلّح طاقت سے نہ کیا جائے۔ میرا عقیدہ ہے کہ تشدد کا مقابلہ تشدد سے کرنا ایسے حالات میں قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے جن حالات میں اسلام تشدد سے کام لینے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ہندستان کی آزادی کی خاطر، میں پوری طرح مہاتما گاندھی کے دلائل کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ اُن سے بالکلیہ متفق ہوں۔ مجھے گاندھی جی کی صداقت پر مکمل اعتماد ہے ....."

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ از مہادیو دیسائی مطبوعہ دہلی ۱۹۴۰ء ص ۲۵۶)

چنانچہ ۱۹۴۰ء میں جب دوسری جنگ عظیم میں ہندستان کی شرکت کا یک طرفہ اعلان وائسرائے نے کیا اور کانگرس اس پر احتجاجی فیصلہ کرنے بیٹھی تو گاندھی جی نے یہاں بھی وہی کہا جو وائسرائے سے کہہ آئے تھے کہ ہم اہنسا کے پابند ہیں۔ اور ملک کی آزادی کی خاطر ——— انگریزوں سے تعاون کرنے میں بھی اہنسا کی حد سے باہر نہیں جائیں گے

لیکن ورکنگ کمیٹی بصدارتِ ابوالکلام اس بیان پر راضی نہ تھی مولانا نے ورکنگ کمیٹی کی تائید کی تے ہوئے، راج گوپال آچاریہ کوشش دی کہ وہ اس خیال کو بڑھاوا دیں کہ اگر برطانوی حکومتِ ہند بعد از جنگ ہماری آزادی کا کھلا اعلان کر دے یا مرکز میں بااختیار قومی حکومت بٹھا دے تو ہم عملی تعاون کریں گے، صرف اخلاقی نہیں، بزور بازو بھی۔ (مولانا از مہادیو دیسائی اور ہماری آزادی)

اس معرکے میں جواہرلال نہرو اور مولانا قطعی ہم خیال اور ہم آواز تھے - یہاں تک کہ گاندھی جی کو جو "مہاتما" اور "باپو" کی حد پرستاری کے آخری درجے پر پہنچے ہوئے تھے - (پھر وہ بات نہ رہ گئی) راجندر پرشاد اور خان برادران جیسے جاں نثاروں کی تائید کے باوجود خود کو ورکنگ کمیٹی کے دائرے سے الگ رکھنا پڑا۔

مولانا نے ایک بار (۱۹۴۰ء) جیل کی ملاقات میں گاندھی جی کو ٹوکا بھی کہ انھیں تشدّد اور عدم تشدّد کے مسئلے پر حتمی بیان دینے کا حق نہیں پہنچتا —— یہ حق صرف کانگرس ورکنگ کمیٹی یا اس کے صدر اور ترجمان کو ہے (مولانا ہی صدر رہے اور گاندھی جی کی تائید کی بدولت صدر رہے)

جواہرلال نہرو نے ایک سے زیادہ موقعوں پر "مہاتما" سے نہ صرف اختلاف، بلکہ سخت ناگواری کا اظہار کیا، لیکن دونوں ہی (گورو چیلا) دل میں جانتے تھے کہ کسی نہ کسی نقطے پر اختلاف کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ وہ صورت نکالنے میں کم از کم چار بار (۱۹۲۳ء - ۳۹ء - ۴۲ء - ۴۶ء) ابوالکلام کے ناخن تدبر نے گرہ کشائی کی گاندھی جی کے سابق سکریٹری مہادیو دیسائی اپنا تبصرہ کرتے ہیں:

> "...... ٹیننسی اور انکم ٹکس کی قانون سازی، دونوں معاملوں میں جب گفت وشنید ٹوٹنے پر آنے لگی تو مولانا کی زبردست فراست ہوشیاری، اپروچ کے طریقے اور خوش معاملگی نے صورتِ حال کو (بگڑنے سے) بچا لیا۔....."
>
> (ص ۱۰۲ وہیں)

چنانچہ وہ قلمکار اور کالم نگار، جو مولانا کی دوراندیشی کی داد دینے کے اہل نہیں، ان کے اس مسلسل عمل کے باعث انھیں (سمجھاؤ بجھاؤ والا) '' COMMITTEE MAN '' کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر مولانا کی یہ آخری یادداشت (INDIA WINS FREEDOM) اور بعد کے مطبوعہ اردو خطوط کے مجموعے موجود نہ ہوتے، تب بھی بے جانب مورّخ اس حقیقت کو چھپانے میں ناکام رہتا ہے کہ

ہندستان میں از ۱۹۰۵ تا ۱۹۴۵ء واقعی دو مدِّمقابل طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور انڈین نیشنل کانگرس ——— اور کانگرس پارٹی میں طاقت کے دو بلاک کام کر رہے تھے ——— دایاں اور بایاں بازو (اشتراکی فرنٹ سمیت) اور ان دونوں کے درمیان توازن کی فیصلہ کُن قوت کا نام تھا جواہر لال نہرو + ابوالکلام آزاد،

گاندھی جی، سو ان کی حیثیت پارٹی سے بالاتر اور سرپرست کی سی رہی۔ راج گوپال آچاریہ اپنے جنوبی ہند کے نفسیاتی گوشے (یا COMPLEX) کے ساتھ کانگرس ہائی کمان میں گاندھی جی کے بعد باقی سبھوں کے لیے محترم تھے ـــ مگر وہ نہ گاندھی جی کے فرماں بردار ہوکر رہ سکتے تھے، نہ دائیں بازو والوں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے سکتے تھے۔ سردار پٹیل، راجندر پرساد، خان عبدالغفار خاں، اور ہائی کمان کے دوسرے (اَدلتے بدلتے) ممبروں میں ایک دن بھی ایسا نہ آیا کہ کوئی گاندھی جی سے اُلجھا ہو، اوّل الذکر دونوں کی بابت تو مولانا نے ریکارڈ کر ہی دیا ہے کہ وہ صرف گاندھی جی کے آوردہ اور پروردہ تھے۔ (بذاتِ خود کچھ بھی نہیں۔) اگر مولانا نہ لکھ جاتے تو بھی اس کی شہادتیں موجود تھیں۔ مثلاً خود گاندھی جی کے سابق آشرمی رفیقِ خاص اندولال یاگنک کی تصنیف GANDHI AS I KNOW HIM ، جس کا بغور مطالعہ کیے بغیر گاندھی جی کے علاوہ، قومی تحریک کے کئی مستقل صدر نشینوں کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ

خود مولانا کس کے لیڈر تھے؟

یہ سوال ہیں نے گذشتہ دو برس کے دوران مولانا سے متعلق کم از کم آٹھ سیمیناروں

(بمبئی، ناگ پور، جمشید پور، بنگلور، میسور، لکھنؤ، بھوپال۔ علی گڑھ) یا عام جلسوں میں اٹھایا اور جواب کا انتظار بھی کیا ہے۔ واقعی سوچا جائے مولانا کس گروہ، طبقے، فرقے کے ترجمان اور رہنما تھے؟ شروع سرگرمی کے بعد جب وہ کل ہند میدان میں اُترے، عربی اور اسلامیات کے حلقے سے "امامُ الہند"، نہ مانے گئے، اُن کا حلقۂ درس ٹوٹ گیا، اخبار بند ہو گیا (جسے قدیم تربیت کے زیادہ تر مسلمان پڑھتے تھے) ملک میں جو راسخ العقیدہ مسلم حلقے تھے وہ زیرِ اثر تو برسوں رہے البتہ بہت کم وقت ابوالکلام کے زیرِ فرمان رہے۔ ان کا قبلہ تھا یا دیوبند، یا مظاہر العلوم، تھانہ بھون اور اسی طرح کے عربی اسلامی مرکز۔ ابوالکلام کا احترام اسی قدر تھا کہ عالم ہیں سرفروش ہیں، عملی ہیں، خوب لکھتے ہیں محض اتفاقِ وقت نہیں کہ اُن کے "ترجمان القرآن" جیسے شاندار علمی کارنامے کو دیوبندی یا بریلوی کسی بھی مسلم فقہی مرکز سے داد نہیں ملی۔ پرانی چال کے شدّت پسند علما کو تو سانپ ہی سونگھ گیا۔ اس کے سامنے علی گڑھ یونی ورسٹی اور اسی وضع کے اینگلو مسلم ادارے تھے۔ ان کے اپنے حلقے تھے شہری درمیانہ طبقے، ملازمت پیشہ لوگ، انگریزی اخبار پڑھنے والے عمومًا مولانا سے برگشتہ یا بدگمان۔ تھوک کے (بمبئی، کلکتہ، احمد آباد، مدراس) بیوپاری ویسے ہی سودیشی مال کے ایجی ٹیشن سے بدحواس تھے۔ بدیسی کپڑے اور دِساوری مال کے بائکاٹ کی تعلیم کو مولانا نے "شرعی فریضہ" بنا ہی ڈالا تھا۔ کوئی بڑا تعلیمی، تدریسی، مذہبی یا صنعتی مرکز مولانا کے جاں نثاروں یا ماننے والوں کا نہ تھا (شاید اسی بنا پر غلط اندازہ کر کے سرائیں بورو نے "گاندھی" نامی فلم میں مولانا کا ایک حقیر سا خاکہ پیش کیا ہے)۔ جب اس سوال کا دوٹوک جواب سامنے سے نہ آئے تو کانگرس تحریک کے پچاس برس کی تاریخ (۱۹۰۵۔۵۵ء) کے اندر سے جواب ملے گا۔ دراصل ابوالکلام کی شخصیت میں کئی ایسے عناصر یکجا تھے جو آج بھی ہمارے زمانے میں اہمیت رکھتے ہیں اور ہر دَور، ہر موڑ پر قومی رہنماؤں نے ان سے فیض اُٹھایا:

نپے تُلے مذہبی عقائد، قدیم مذہبی تربیت کے باوجود جدید ترین روشنی سے آگاہی۔ اور باخبری کی مسلسل کوشش + ذہنی اُفق کی مسلسل توسیع + قومی آزادی کے نرم

اور گرم دھاروں سے نظری اور عملی آگاہی • انتھک سرگرمی • انسانی نفسیات میں گہرے اُتر کر فرداً فرداً مسائل سُلجھانے کی صلاحیت • فرقہ وارانہ اتحاد اور قومی آزادی کو لازم وملزوم سمجھنے پر پختہ ایمان • تاریخ ہند کے پیچیدہ اور باہم دگر دست وگریباں مظاہر کی معروضی (OBJECTIVE) فہم اور بے تعصّبی • عالمی واقعات کی رفتار اور نتائج پر نظر، جان ومال کی قربانی دینے میں بے دریغ ہمت • حقیقت پسندی • شدید تنا و کے عالم میں اعصاب پر قابو اور ٹھنڈے دل سے فیصلے تک پہنچنا اور بالآخر، سب سے بڑھ کر یہ کہ عزتِ نفس کے ساتھ بے غرضی ـــــ قطعی بے نفسی۔

خود مولانا کو اس کا احساس تھا۔ بالکل آخری دَور میں، جب وہ ایک بار (ہندی کا دشمن نمبر ایک،، طعنے سُن سُن کر) پارلیمنٹ میں بپھر گئے اور پرشوتم داس ٹنڈن جی کا جواب دینے کھڑے ہوئے تو یہی کہا کہ بے غرض عمر بسر کرنے پر انسان بے پناہ ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے کوئی مصلحت نہیں روک سکتی۔ سننے والے بتاتے ہیں کہ مولانا کی اس تاریخی اور مختصر للکار پر در و دیوار لرز گئے تھے، کسی نے سانس تک نہیں لیا۔

یوں دیکھیے تو روشن ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری قومی تاریخ کے متحدہ ہندستان کے، اور ان قدروں کے جو اس بدنصیب ملک کو متحد رکھنے کے لیے لازم تھیں عظیم الشان نمایندے تھے، اُن کا مجموعہ تھے، اور حیرت انگیز طور پر وہ کئی انتہاؤں کا ست یکجا کر لینے والے ایسا وجود تھے جس کی قدر وقیمت مہاتما باپو اور نہرو باپ بیٹے ہی کر سکتے تھے۔ اسی حیثیت میں ابوالکلام ہائی کمان کے تین چار بنیادی ستونوں میں سے ایک رہے اور نیتاؤں کے نیتا شمار کیے گئے۔ وہ عوام کے نہیں، خواص کے، نعروں کے نہیں، فیصلوں کے، جلوسوں کے نہیں، سبجکٹ کمیٹیوں کے، اور سیلابوں کی سطح پر چمکنے والے نہیں، آبِ رواں میں صَدفِ تہ نشین رہنے والے لیڈر تھے۔ ہماری قومی سیاست میں اُن کی یہی حیثیت ہے۔

ابوالکلام تن آسان اور آسایش پسندوں میں سے اُٹھے لیکن دشوار کام اپناتے

چلے گئے ۔ اُنھیں جسمانی مشقت کی عادت شروع سے نہ تھی ۔ جیل میں جواہرلال ٹوکری پھاوڑا کدال لے کر اجاڑ زمین کو ہریالی دینے پر کمربستہ ہوئے ہیں ، ابو الکلام دور بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں ۔ مطالعہ یا خطوط نویسی میں اتنے محو ہیں کہ پرندے کاندھے پر بسیرا کرنے اُتر پڑتے ہیں ۔ جسمانی حرکت و مشقت کو وہ (شاید اپنی نفاست پسندی اور راحت طلبی کے مارے) اپنا نہ سکے لیکن کیا مجال، جو اوقات کی تقسیم اور پابندی میں کوئی شوق، کوئی مشغلہ حائل ہو جائے ۔ نفاست پسندی جواہرلال کو ورثے میں اور گھر سے ملی تھی ، راحت طلبی بھی ضرور رہی ہوگی کہ اَرِسٹاکریسی (اشرافیہ) کی خصلت ہے ۔ لیکن مغربی تربیت اور انگریزی ماحول نے (کہ جہاں بانی اور جہاں گیری کرنے والے راحت طلب نہیں ہوا کرتے) دونوں صفات کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ——— اور جواہرلال نے اس تربیت کو جسم و جان میں بسا لیا ۔

زندگی کے ہر ایک سال میں سے کم و بیش ڈیڑھ مہینے جیل میں بسر ہوئے ۔ جیل کی زندگی کے بارے میں مولانا اطلاع دیتے ہیں کہ :

> "میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے ۔ اس میں ایک جزو رواقیہ STOIC ہے اور ایک لذتیہ (EPICURIUS) کا ...... جہاں تک حالات کی ناگواری کا تعلق ہے رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں ... جہاں زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں ....
> راحت و اَلم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دیا کرتا ۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے اور کبھی مرہم بن جاتا ہے" ....

یہ ہے مولانا کا وہ فلسفۂ حیات جو اُنھیں ہمسر اور ہم عصر لیڈروں میں ایک بے پناہ شخصیت بنائے ہوئے تھا ۔

سگرٹ مولانا کی بڑی کمزوری تھی ۔ پے در پے سُلگاتے تھے ۔ گاندھی جی کے سامنے کیا

ان کے سابرمتی یا وردھا آشرم میں بھی کوئی بیڑی سگرٹ پینے کی جرأت نہ کرتا، مگر مولانا کا ہاتھ نہیں رُکتا تھا وہ ہچکچاتے بھی تو گاندھی جی کی عالی ظرفی اسے کب گوارا کرتی، مولانا کے سامنے بطورِ خاص ایش ٹرے رکھ دیا جاتا تھا اور وہ اُسے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔

لیکن یہی ابوالکلام جونہی جیل کے پھاٹک میں قدم رکھتے ہیں، سگرٹ اور لائٹر کو جُدا کر دیتے ہیں، اور برسوں ہاتھ نہیں لگاتے۔ اِدھر حکم رہائی پہنچا۔ قدم احاطے سے باہر کی طرف اُٹھا، اُدھر پہلی طلب تمباکو نوشی۔

ارادے کی یہ غیر معمولی قوت یہ DETERMINATION اور صمیم قلب، جو مولانا کو نصیب تھا، جواہر لال کو اس مقدار میں نہیں ملا۔ وہ ہر مسئلے پر، ہر فیصلے پر دیر تک، دنوں تک تذبذب میں مبتلا رہتے۔

مولانا نے اپنے "چڑیا چڑے والے"، خط (۱۹ء) میں ہمّتِ مردانہ والے چڑے کو قلندر اور "زدیم برصفِ رنداں و ہرچہ بادا باد" کا بے خطر قدم بڑھانے والا کہا ہے، وہ اس کہانی کا ہیرو ہے۔

مولانا بھی اس پچاس برس کی الجھی ہوئی مگر بیدار کہانی کے ایک ہیرو ہیں۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں انھوں نے گاندھی جی کی "صداقت و ہمّت" کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ گاندھی جی کے آخری دنوں (۱۹۴۷) میں برت کھولنے کے لیے موسمی کا رس بھی مولانا کے ہاتھوں نے ان عمر رسیدہ اور مرانہ ہاتھوں میں دیا۔

مولانا کے شخصی اثر و وقار، آہنی کردار، نپے تُلے آداب و اطوار کی سمائی قومی رہنماؤں کی صفِ اوّل میں ہی ممکن تھی اور عمر بھر — کم از کم ۳۵ سال وہ اسی میں رہے جب اُن کے ماننے والوں اور نظریات پر ایمان لانے والوں کی صفیں سکڑ چکی تھیں، تب بھی وائسرائے لارڈ ویول، سر اسٹیفورڈ کرپس، اور روزیرِ ہند پیتھک لارنس اُن کا وہی احترام کرتے تھے جو کسی آزادی پسند قوم کے ہیرو کا کیا جاتا ہے اور معاملات کی

ہٹہ داری میں مولانا کی گفتگو کے جو اقتباس (ایک کے سوا جس میں ALEINS کا لفظ ماؤنٹ بیٹن کو کھٹکا تھا) اب برطانوی محافظ خانے نے منظرِ عام پر رکھ دیے ہیں، وہ یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ مولانا کی سیاسی بصیرت دور تک انجام کے آغاز کو دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی وہ ایک ناکام لیڈر کی طرح اور زلزلے میں ایک منزل اُترے ہوئے قطب مینار کی طرح ان کالم نگاروں اور اخبار نویسوں کو نظر آتے ہیں جو قومی تحریک کے انقلابی منظر نامے کو صرف دستاویز سمجھ کر اس نیت سے قلم اُٹھاتے ہیں کہ ابوالکلام کی "نارسائی" اور "ناروائی" میں پہلو کی (مثلاً جواہرلال کی) یا مقابل کی (مثلاً محمد علی جناح کی) شخصیتوں کو اُبھاریں اور اس بہانے طاقتِ فرماں روا کی خوشنودی برقرار رکھیں۔ (میرا اشارہ اُن دو تازہ ترین مشہور سوانح عمریوں کی جانب ہے کہ ایک ہندستان، دوسری پاکستان میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہیں)۔

عملی اعتبار سے، اور تاریخ کو واقعات کا ایک سلسلۂ دراز اور جدلیات سے بھرا ہوا عمل نہ سمجھنے سے اُسے حادثوں کا تسلسل ماننے والوں کی نظر میں مولانا واقعی ہر فیصلے، ہر مطالبے اور اندازے میں ناکام سدھارے ناکامیوں کی ایک پوری پوتھی ان کے نام لکھی گئی ہے۔

مولانا کی ناکامیوں سے جو نتائج سیکھنے کو ملتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

۱- تاریخ کے سفر میں فرد کا رول ہوتا ضرور ہے، لیکن دوسرے بہت سے عوامل (FACTORS) بھی کام کرتے ہیں، کئی ایک راہیں کئی ایک لکیریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔

۲- سیاسی داؤ پیچ، گروہوں اور افراد کے فیصلے اور اقدامات فوری طور پر تاریخی دھارے کو کوئی من مانی سمت دے سکتے ہیں لیکن وہ پایدار حل نکالنے سے عاجز رہتے ہیں مادّی، معاشی اور نفسیاتی عوامل ہیں جو بالآخر اپنی راہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

فاسد مادّہ اور راہ نکلنے تک فساد برپا رہتا ہے ۔

۳- لازم نہیں کہ کسی فرد کی، رہنما کی، گروہ کی سوچی ہوئی تدبیر جو آج کے حالات میں ناکام ہو گئی ہو وہ مستقلاً ناکامی کے غار میں گر کر ناپید ہو جائے ۔ زیر زمین دفن کی ہوئی بعض تدبیریں اور تجویزیں، حالات اور موسم کی ہوا پاکر کبھی کبھی پھوٹ بھی نکلتی ہیں۔ جڑ پکڑ لیتی ہیں ۔ عجب نہیں کہ مولانا کی فکری تخم ریزی کو بھی یہ دن دیکھنا نصیب ہو۔ تب یہ ایک پریشان خیالی تھی کہ ملک بٹے اور فوج نہ بٹے ۔ آج اور آنے والے کل میں جب یوروپ کے ماضی میں برسرِ پیکار الگ الگ ملک اپنی پارلیمانیں توڑ کر ایک کر رہے ہیں، جب مختلف قومی فوجوں کے درمیان اس قدر تال میل پیدا کیا جا چکا ہے کہ سارے مغربی یوروپ میں ایک ہی فوجی G.H.Q. (جنرل ہیڈ کوارٹر) اور ایک ہی آپریشن پلان بنتا جا رہا ہے، بھاری خرچوں کے رازدارانہ پروجیکٹ کئی کئی ملکوں میں باہم جوڑے جا رہے ہیں، ایک دوسرے کو ہتھیار سپلائی کرنے کے بجائے تیسری دنیا کے مقروض خریداروں کو گرانٹ اور قرض دینے میں شرکت کر رہے ہیں، یہ رنگ پکڑتی ہوئی دنیا میں آگے چل کر جنوب مغربی ایشیا کے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ملکوں کا خود مختار رہتے ہوئے بھی فوجی قوّت یکجا یا مشترک کر لینا کچھ بعید نہیں ۔

ذرا اور ڈوب لیں، پانی ناک سے اوپر جانے لگے گا تو تیرنے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں ماریں گے ۔ تب ابوالکلام پھر ہمارے درمیان ہوں گے ۔ اب ذرا کیبنٹ مشن پلان ۴۶ء کی بنیاد کو بھی مولانا کی نظر سے آج کے نقشے میں دیکھ لیجیے!

اشوک، اکبر اور اورنگ زیب کے مختلف اَدوارِ حکومت میں شمالی ہند سے جن علاقوں تک عملداری پھیلی ہوئی تھی آج وہ پانچ چھے خود مختار ملکوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک لمبی رسّی کمر میں لپیٹے ہوئے کوہ پیماؤں (ALPINISTS) کی طرح سب ایک دوسرے کے سہارے ٹکے ہوئے ہیں۔ تنا تنی کی حالت میں سب کا اختیار رکھ کر رہنا ہے ۔ مولانا نے ہندستان کے نقشے پر علاقہ وار تین چار گروپ تجویز کیے تھے جو معاشی

نابرابری اور تہذیبی ناہمواری کے سبب باہم گروہ بند بھی ہوتے اور ایک مرکز سے توازن بھی قائم رکھتے۔

مولانا کی پچاس برس کی سیاسی اور ذہنی سرگرمی، تدبّر اور تدبیر کا سب سے معرکہ آرا نقشا جو لارڈ ویول کے ہوتے قریب قریب سب فریقوں نے مان لیا تھا۔ جتنی بڑی ٹریجیڈی کا شکار ہوا، دنیا بھر کو خبر ہے لیکن کیا دنیا کو یہ بھی خبر ہے کہ بار کر ایک روز فیڈرل ہندستان رنگ روپ نکالے تو پھر وہ اسی تین یا چار گروپوں میں تقسیم علاقوں اور ایک مرکز سے وابستہ ملک کی صورت میں اُبھر سکتا ہے جو مولانا کی بصیرت نے تجویز کیا تھا۔

ایک شخص نے کسی مرحوم بادشاہ سلامت کو خواب میں دیکھا کہ بدن تو ہے نہیں، البتہ آنکھوں کی پتلیاں چمک رہی ہیں اور گھوم گھوم کر دیکھ رہی ہیں۔ اس خواب کی تعبیر بتائی گئی کہ " ہنوز دو چشمش نگرانست کہ مُلکش بادِگرانست"، (ابھی تک اس کی آنکھیں بے قرار ہیں کہ اس کا ملک دوسروں، غیروں کے قبضے میں ہے)۔ کیا عجب کہ غلامی سے آزادی میں اور پسماندگی سے دورِ حاضر کی ترقی میں قدم رکھنے والے ہندستان کا ایک نازک مزاج، زخمی دل و دماغ کا عالی شان شہزادہ ابوالکلام پردۂ اسرار سے سر نکال کر دیکھتا ہو کہ کب وہ وقت آئے اور کب تاریخ و جغرافیہ کی قابلِ تقسیم حقیقتیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جائیں۔

"...... ہنوز دو چشمش نگرانست کہ مُلکش بادِگرانست"

ابوالکلام کا ذہنی سفر

" صرف ہندستان ہی کی تاریخ دیکھ لی جائے۔ اوائلِ شیوعِ اسلام سے آخر تک کوئی اہلِ حق ان فتنوں سے نہ بچا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ شیخ الاسلام ملتانی، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ (رضی اللہ عنہم) ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جن کو وقت کے فقیہوں اور قاضیوں نے چین سے بیٹھنے دیا ہو۔ کسی پر کوئی الزام لگایا، کسی پر کوئی الزام۔ خواجہ قطب الدین کاکی کے عہد کے شیخ الاسلام نے جب دیکھا کہ کچھ نہیں چلتی اور خلق اللہ پروانہ ہورہی ہے، تو ایک فاحشہ عورت کو پانچ سو دینار لالچ دلاکر آمادہ کیا کہ برسرِ دربار خواجہ صاحب پر زنا کا الزام لگائے۔ لیکن جب موقع آیا تو ان کی ہیبتِ حق نے مہلت نہ دی اور خود اس عورت ہی نے اصلی واقعہ ظاہر کردیا۔ بڑی جلن ان لوگوں کو اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم شریعت کے مالک ہیں؛ جب تک مسئلہ نہ بتلائیں نہ کسی کا غسل ٹھیک ہو اور نہ وضو۔ پھر کیا ہے کہ دنیا ہمیں چھوڑ کر دوسروں کی طرف جاتی ہے؟ ہم نے بھیک کی روٹیاں کھاکر دنیا جہان کی کتابیں چاٹ لیں، لیکن پھر وہی مُلّا کے مُلّا۔ شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ بھی ہوگئے، تو کیا ہوا! لوگ سہم کر ڈرنے لگے، مگر دلوں کی

عقیدت وارادت تو نہ ملی! یہ کیا اندھیر ہے کہ ایک فقیر بے نوا پھٹی کملی اوڑھ کر کسی کھنڈر میں بیٹھ جاتا ہے۔ "ہدایہ" کی چار سطریں سامنے رکھ دیں، تو ہوش و حواس گم ہو جائیں۔ "قدوری" اور "کنز" بھی پوری نہیں پڑھی۔ اس پر عالم گیریوں اور جہاں ستانیوں کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں دلوں کا مالک! آبادیوں کی آبادیاں ہیں کہ سمٹی چلی آرہی ہیں! افسوس، ان بندگان نفس کو کون سمجھائے کہ کارخانۂ الٰہی کے تعزز و تذلل کا صرف وہی قانون نہیں ہے جو تم نے مولویت و مشیخت کی مسندوں پر بیٹھ کر سمجھ رکھا ہے۔ مدرسوں کی دماغ سوختگیوں کے علاوہ بھی کچھ کرنے کے کام ہیں، اور شاید سارا دارومدار انہی پر ہے اصلی طاقت عمل کی ہے، نہ کہ مجرد علم کی۔ ابن ماجہ کی روایت یاد آگئی "قلوبھم مفاتیح الھدی۔ یخرجون من کل غبراء مظلمہ"۔

"تذکرہ" ص ۲۹۸ (ساہتیہ اکادمی اڈیشن ۱۹۶۸ء)

یہ مولانا کی تصنیف "تذکرہ" کا خود نوشت حاشیہ ہے جو ۱۹۱۷، ۱۸ ۱۹ء میں کسی وقت لکھا گیا۔ جب وہ رانچی میں نظر بند تھے۔ اگر بتایا نہ جائے کہ یہ اُسی ابوالکلام کی تحریر ہے جس نے پیری مُریدی کی آبائی مسند سے مُنہ پھیر کر قدم باہر نکالا تو قرونِ اولیٰ کے خالص اسلام اور علمائے امّت کی اُن تعلیمات نے دامن تھاما جو بدعتوں کے خلاف اور صوفیا کے (بدعتی؟) طور طریق سے بیزاری کی تبلیغ کر رہی تھیں تو دو مختلف ذہنوں اور متضاد ذہنیتوں کا اظہار نظر آتے۔ سرسیّد احمد کی سائنسی خالص اسلام والی تحریک اور تحریروں سے اِسی مرحلے پر اُن کی آشنائی ہوئی۔ "سائنسی" اِس معنی میں کہ وہ اوّلین اسلامی تعلیمات کو قانونِ فطرت کے جدید ترین اور معاصر انکشافات سے مطابق پاتے اور مطابقت دکھاتے تھے اور "خالص اسلام" والی اِس لحاظ سے کہ بعد کے عجمی، غیر اسلامی اثرات سے، فلسفیانہ تاویلات سے اور صوفیانہ رسوم سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر اس ذہنی تحریک اور تہذیبی اصلاحی تبلیغ کو عُرفِ عام میں کہیں تو یہ "وہابیت" کہلائے گی۔ مولانا ابوالکلام سرسیّد کی وہابیت سے اِسی طرح متاثر ہوئے جیسے اُن کی عقلیت پسندی اور نیچرل سائنس

کے احترام سے۔ یہاں تک کہ بقول خود:

"۔۔۔ سرسیّد کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کرلی اور یہ ہوا کہ ایک عقیدتمند کی طرح، جو اپنے شیخ و مرشد کے ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل وجان دے کر خریدنا چاہے، اُن کی تصنیفات کا ہر ورق و صفحہ میں نے نہایت جدّ و جہد سے حاصل کیا ۔۔۔(۱)

۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت سے یا سرسیّد کی اصطلاح میں ٹھیٹ (ٹھیٹھ؟) اسلام سے آشنا نہیں۔ قرآن کے اصلی حقائق و معارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر تیرہ سو برس بعد اِس مجدّدِ اعظم نے پردہ اٹھایا ہے ۔۔۔ (۲)

۔۔۔ جن کی نسبت سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے موجودہ زمانے میں مذہب اور موڈرن سائنس کو ملانے کے لیے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی، مجھ پر ان کی تصنیفات کا بہت اثر پڑا، حتّیٰ کہ کچھ دنوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل ان کا مقلّد اور پیرو ہوگیا ۔۔۔ (۳)

(تصانیف مولانا ملیح آبادی (۱) آزاد کی کہانی۔ ص ۲۵۲۔ (۲) وہیں ص ۸۳،۳۸۲۔ (۳) ذکرِ آزاد ص ۲۵۸)۔

جن برسوں میں مولانا، سرسیّد کے زیرِ اثر اسلام کی فطری سادگی اور جدید قدرتی سائنسوں کی معقولیت میں محو تھے، اُن کے بمشکل تین چار سال بعد وہ ایک ایسی ذہنی کیفیت سے گزرتے ہیں جس کا مطالعہ ہم دو سمتوں سے کرسکتے ہیں اور دونوں سمتیں "عشق" کے نقطے پر آکر مل جاتی ہیں۔ خود "تذکرہ" میں اس مختصر دورِ حیات کا بڑی للک سے تذکرہ کیا ہے:

"۔۔۔ بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے:

ہاں بانگ بلند ست ایں، پوشیدہ نمی گویم

گمراہی عمل کی آخری حدِ فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سوفسق و الحاد
کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو۔ اور فسق خود
بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اصل میں منزلیں تین ہی ہیں!
ہوس، عشق، حقیقت ۔ ۔ ۔ اور یہاں عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی
مجاز ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۱۸، ۳۱۶)

"تذکرہ" کا یہ حوالہ "فسق و الحاد کی" ہر قسم سے گزر چکنے کے کافی بعد کا ہے لیکن اس حوالے
سے جس کی چھینٹیں اور موقعوں پر بھی نظر آتی ہیں ہمیں یہ سراغ مل جاتا ہے کہ فقیہانہ
یبوست، عالمانہ تمرّد اور اصول پرستانہ سخت گیری کی گرفت سے وہ کن تجربوں اور
کیفیتوں سے گزر کر آزاد ہوئے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اکیس بائیس برس کی عمر کو پہنچ کر
وہ عشق کی بے باکی و بے نیازی، سرفروشی و جانبازی پہ مچل جاتے ہیں اور مولویت کے
جُبّہ و دستار، نمازِ عیدین کی امامت اور خطابت سنبھالے ہوئے وہ شاندار مقالہ
لکھ ڈالتے ہیں ـــ "حیاتِ سرمد" جس کی برقی رو کو چھوئے بغیر ابوالکلام کے دل و دماغ
کی اُن لرزشوں سے آشنا ہونا مشکل ہے جن لرزشوں نے آگے چل کر "ترجمان القرآن"
کو بیک وقت ایک سالک مجذوب کا علمی روحانی کارنامہ بنادیا۔

۱۹۱۰ء کی تصنیف "حیات سرمد" معرکے کی چیز ہے۔ اگر ہم نظر میں رکھیں کس عمر کس دورِ زندگی،
کس ذہنی کیفیت اور کس روحانی کسک نے ابوالکلام کو اس مقالے کے لیے آمادہ کیا اور
سرمد (شہید) کے روپ میں بے اختیار خود مصنّف کو کیسے آشکار کردیا تو ہمیں ان کی زندگی
کے باقی پچاس سال میں ظاہرا تضادات کی ساری گتھیاں کھلتی نظر آئیں گی:

"۔ ۔ ۔ ۔ جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی
کردو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب و جنوں اس طرح چھایا
کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاعِ تجارت بھی غارت کردیا۔ دنیوی
تعلّقات میں سے جسم پوشی کی بیڑی باقی رہ گئی تھی، بالآخر اس بوجھ سے
بھی پانو ہلکا ہو گیا۔ ۔ ۔ (ص ۱۵)

جب اور کوئی بہانہ نہ ملا تو عریانی و برہنگی کو کہ خلافِ رسمِ شرع ہے، بنیاد قرار دیا۔ ۔ (ص ۲۰)

۔ ۔ ۔ یہ (علماے) ظاہر پرست نہیں جانتے تھے کہ سرمد اس سے بہت اونچا ہے کہ کفر و الحاد کی بحثیں سنائی جائیں اور وہ قتل و خون کے احکام سے مرعوب ہو؛ کفر ساز تو اپنے مدرسہ و مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر سوچتے تھے کہ اس کی کرسی کتنی اونچی ہے اور وہ اس منارۂ عشق پر تھا جہاں کعبہ و مندر بالمقابل نظر آتے ہیں اور جہاں کفر و ایمان کے عَلَم ایک ساتھ لہراتے ہیں۔ ۔ ۔ (ص ۲۲)

جب سَرمد کو شہادت گاہ لے چلے تو بیان کیا جاتا ہے کہ تمام شہر ٹوٹ پڑا تھا اور اس قدر ہجوم تھا کہ راہ چلنا دشوار ہو گیا۔

عشق کی نیرنگیوں کو کیا کہیے جہاں کا عام پسند تماشا خوں ریزی ہے۔ جہاں قربانی سے بڑھ کر کوئی دل پسند کھیل نہیں جب کوئی سردار سر بکف بڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دولھا کی سواری جا رہی ہے اور براتیوں کا ہجوم ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ ۔ ۔ (ص ۲۳)

یہاں تک تو کوئی اور بھی پہنچ جاتا مگر ابوالکلام عشق کے اِس معرکے سے (اور اپنے تجربات کے شانے سے شانہ رگڑ چکنے پر)، یہ ماحَصل اٹھاتے ہیں:

" ۔ ۔ ۔ ۔ ایشیا میں ہمیشہ پالٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے اور ہزاروں خوں ریزیاں، جو پولٹکل اسباب سے ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اُڑھا کر چھپایا گیا۔ ۔ ۔ " (وہیں ص ۲۰)

شروع میں ہی ہم نے جو اُوپر تلے یہ اقتباسات چُن دیے مولانا کی تحریروں سے تو اُن کی غرض صرف اتنی ہے کہ اُن مدارج اور مراحل کے درمیان باریک سے مگر مضبوط رشتے کی نشاندہی کر سکیں جس میں موصوف کے وجود کے جُدا جُدا اور رنگا رنگ دانے پروئے ہوئے ہیں اور جن کے مابین تضاد کا نہیں، ارتقا کا، بے تعلقی کا نہیں تعلق کا

خلفشار کا نہیں پیوستگی کا، اندرونی اثر اور تاثیر کا اور مسلسل وسعت و صلابت کا منظر پوشیدہ ہے۔

اس جینئس کی حیات، سیرت، کارناموں، کامرانیوں اور ناکامیوں کا جو پنورا ما ہمارے سامنے کھلتا ہے وہ نہ یک رنگ ہے، نہ ایک سار، نہ خط مستقیم پر ہے، نہ ہموار ـــــ البتہ اس کے اُتار چڑھاؤ میں ایک منطقی معقولیت، گہری دانشمندی اور ذہن و عمل کی رازدارانہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ خاموش تفکّر نے سیاسی سرگرمی کو اور شب و روز کی سیاسی بساطِ شطرنج کی حکمتِ عملی نے علمی جستجو کو ذہنی رسائی کو رد کا نہیں، ٹوکا نہیں ـــــ بلکہ اس کے برعکس سہارا دیا ہے، ایک نے دوسرے کی تکمیل کی ہے، توسیع کی ہے، ترمیم کی ہے ـــــ اور باہمی اضافہ بھی کیا ہے۔

(۲)

ارتقا کا نظریہ

جسمانی اور ذہنی ارتقا کا نظریہ اسلامی حکما کے لیے کوئی عجوبہ نہ تھا۔ فلاسفۂ یونان کے تراجم اور عجمی روابط کی بدولت متکلّمین (خلافت عبّاسیہ کی پہلی دوسری صدی میں) یہاں تک تو آ گئے تھے کہ قرآن و حدیث سے اگر اس نظریے کی پوری تائید نہیں ہوتی تو صاف ردّ بھی نہیں نکلتا۔ "اخوان الصفا" کے رسائل میں ارتقائے اجسام کو، بہت بعد کے نظریۂ ارتقا (EVOLUTION OF SPECIES) کے قریب قریب پہنچا کر پیش کیا گیا ہے (اگرچہ اس کی پشت پر سائنسی مشاہدے نہیں تھے) "تذکرہ" کی عبارتوں میں، جہاں مولانا اجتہاد کی اہمیت، زندگی بخش اہمیت جتاتے ہیں:

"... فی الحقیقت خلیفۂ وقت و ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اُسی کے سدّ باب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔" (ص ۱۴)

وہیں یہ ہوتا تھا کہ اُن کا ذہن کائنات کی متحرک اور دم بدم متغیّر مشین میں

ارتقائے حیات کے سائنسی نظریے کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتا جائے۔ یہاں تک کہ ترجمان القرآن کی جلد اوّل (سورۂ فاتحہ) تک پہنچتے پہنچتے وہ الوہی نعمات ("انعمت علیہم") میں اس تصوّر ارتقا کو بھی سمیٹ لیتے ہیں جسے ایک بار گلے اتارتے یا اپنانے کے بعد اِجتہاد سے مفر نہیں۔ مولانا کے لفظوں میں:

"۔۔۔ ذرّات سے لے کر اجرام سماوی تک سب نے اِسی قانون تغیّر وتحوّل کے ماتحت اپنی موجودہ شکل و نوعیت کا جامہ پہنا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر کی طرف چڑھتی ہوئی رفتار فطرت ہے جسے ہم نشو و ارتقا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایک مُعیّن، طے شدہ، ہم آہنگ اور منظم ارتقائی تقاضا ہے جو تمام کارخانۂ ہستی پر چھایا ہوا ہے اور اُسے کسی خاص رُخ کی طرف اٹھائے اور بڑھائے لیے جا رہا ہے۔۔" (ص ۱۶۲)

"ترجمان القرآن" کی جلد اوّل رانچی کے اعتکاف میں قرآن فہمی اور درس قرآنی کا حاصل ہے (۱۹۱۹ء— ۱۹۱۶ء) اور مختصر سورۂ فاتحہ کی "ترجمانی" کے ایک سَو ستّر صفحے خود ابوالکلام کی عقابی نظر، اخلاقی جراَت، اور ذہنی ارتقا کے اس درجے کی خبر دیتے ہیں جو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ ساتھ وسعت اور پختگی کی جانب بڑھتا گیا ہے۔ "ترجمان" لکھنے سے پہلے، مولانا عملی صحافت کے کئی کامیاب تجربے کر چکے تھے، (لسان الصدق، الہلال، وکیل، البلاغ وغیرہ)، ہجوم عام کے درمیان، ہجوم کے برخلاف اور ہجوم کی نفسیات سے خطاب کر چکے تھے۔ غور و فکر کی شب و روز خلوت میں جو موتی وہ پلکوں سے چُنتے ہوں گے انھیں ایک تنظیم و تناسب اور احتیاط کے ساتھ سننے اور پڑھنے والوں کی فہم سے نزدیک لا کر دل و دماغ میں اُتارنا بھی مقصود تھا۔ یہاں وہ تنہا اپنی ذہنی زبان میں اظہار خیال نہیں کر سکتے تھے، بلکہ اس کی خاطر، قرآن کے لب و لہجہ کا جلال اور دل نشیں جمال اپنے رگ و ریشہ میں بسائے ہوئے سنبھلے قدموں سے کئی زینے اتر کر نسبتاً نشیب میں بسی ہوئی مخلوق تک بطور وراثت و امانت پہنچانا بھی تھا۔ ترجمان کی جو دو جلدیں رانچی میں (۱۹۲۰ء تک) تیار ہوئی تھیں، تلاشی میں ضائع ہوئیں اور پہلی بار

۱۹۳۱ء میں منظر عام پر آیئں اُن کے بین السطور میں کیا کیا جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں: اعتقاد کی شدّت میں نرمی و حلاوت کی آمیزش، ربُّ العٰلمین کی تفسیر میں نگاہ کی وہ آفاقی وسعت جہاں نسل، زبان، علاقہ، ملک تو ایک طرف، خود اختلاف مذاہب کی دیواریں بیٹھ گئی ہیں " نعمات " کے شمار میں عقلِ انسانی کے کمالات، اور اس پہلو پر اصرار کہ:

"... وہ (قرآن) جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے یے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود کے باہر جو کچھ محسوس کر سکتا ہے اس میں تفکّر و تدبّر کرے۔ چنانچہ قران کی سورت اور سورت کا کوئی حصّہ نہیں جو تفکّر و تعقّل کی دعوت سے خالی ہو۔ ..." (ص ۴۷)

خود ابوالکلام (جنھوں نے بعد میں، بجا دعوا کیا کہ ہیں تے ۲۷ برس قرآن کا غامض مطالعہ کیا ہے) قرآن کے ان معانی و مفاہیم تک تفکّر، تعقّل، تدبّر اور عملی تناظر کی راہ سے پہنچے تھے۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ ترجمان میں پہلی بار ایک ہندستانی مفکّر مفسّر جتاتا ہے اور بار بار یاد دلاتا ہے کہ مذاہب کی اصل روح ایک ہے، پر دہ محض ظواہر اور رسوم تک رہتا ہے :

"... اس نے کسی مذہب کے پیرو سے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ کوئی نیا عقیدہ یا اصول قبول کرلے بلکہ ہر گروہ سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے مذہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائے۔ ..." (ص ۱۵۴)

"... یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں اور خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ایک ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے ؟ وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ ... جو انسان بھی ایمان اور نیک عملی کی راہ اختیار کرے گا اس کے لیے نجات ہے، وہ تمھاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہو۔ ... (ص ۱۶۳)"

اختلاف مذاہب کی یہ تشریح، جزوی عقائد کی یہ "بے حرمتی"، اور عقیدے پر عملِ صالح کو، یا یوں کہیے کہ زبانی اقرارِ ایمان کے بجائے "دھرم"، یا طریق زندگی کی خوبیوں کو ترجیح دینے اور منسوخ مذاہب سے غیریت نہ برتنے کی یہ نظر، یہ تبلیغ بہرحال وحدت دین کی طرف لے جانے والی تھی۔ پیری مریدی کے تن آسان ماحول سے متنفر نوعمر، جو سائنسی عقلیت پسندی اور خالص شرعی احکام اور ایمان کی تطہیر کا دلدادہ وحدت الوجودی صوفی سرمدکی سرفروشانہ سیرت کا شیدائی رہ چکا، وہ سورہ فاتحہ کی کُل سات آیات میں وہ سب کچھ پالیتا ہے، سمیٹ لیتا ہے جسے اب تک ایک مرحلے پر جزوی طور سے کھوتا آیا تھا۔

"ولا الضالین" میں گمراہوں کے زمرے میں مولانا کے نزدیک وہ لوگ نہیں جو علمائے وقت کے سکّہ بند عقیدوں سے منحرف ہیں، رفض یا بدعت میں مبتلا ہیں بلکہ وہ جو عملِ غیر صالح کے سبب خداوندی نعمتوں سے محروم رہ گئے ہیں۔

ابوالکلام خود کن کن انحرافوں سے گزر کر یہاں تک بلکہ یوں کہیے کہ وحدۃ دین کے اِس گہرے تصوّر تک پہنچے "الہلال" کے بعض شدّت پسند بلکہ ملّائیت زدہ مضامین سے، ہم نشینوں کے تذکروں اور ملفوظات وخطوط سے اور خود کتاب "تذکرہ" سے (جو بہرحال تب تک کی سوانح حیات نہ بن سکی) آڑی ترچھی لکیروں کی صورت میں تقریبًا مکمل گراف ہمیں بہم پہنچتا ہے۔ اب فکرِ اسلامی کی اساس غور و فکر کو قرار دینا (فلسفہ اور سائنسی جستجو اس کے سوا ہے بھی کیا!) اور مذاہب کے اعتقادی مجموعے کو انسانی فلاح و بہبود کے سامنے ثانوی حیثیت میں ڈال دینا —— یہاں تک کہ اسلام کے پیش رو اور معاصر ادیان کو ایمان باللہ اور عملِ صالح پر مرکوز کر دینا، یہ وہ مقام ہے جہاں محی الدین ابن العربی، محی الدین احمد ابوالکلام اور (ابوالہند) موہن داس گاندھی کے درمیان اوقات اور الفاظ کے سوا کوئی فاصلہ نہیں رہ جاتا۔ یہیں اسی بے فاصلگی میں ان کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی (۱۹۲۰ء) مگر ابھی نہیں —— ابھی ہم ایک اور پہلو کا سرسری جائزہ لیتے چلیں۔

تجدید، اجتہاد اور مجدّد

"تذکرہ" بیشتر مولانا کے آبائی اور مادری بزرگوں کے روشن کارناموں کا بیان ہے جن میں ابھارا گیا ہے ان کے علمی مشاغل، دیدارانہ انہماک اور آزادانہ عمل کو بشالوں اور حوالوں سے قطع نظر "تذکرہ" میں زیریں لہر چلتی ہے اس خیال کی کہ اسلام کے اصل اصول "توحید" اور ایمان باللہ و بالرسول کے علاوہ ہر ایک دور کے سیاسی و سماجی حالات ہیں جن کی روشنی میں برتاو کی لائنیں مقرر ہوتی رہی ہیں اور ہونی چاہییں۔ اصول فقہ برقرار رہتے ہوئے فقہی مسائل کے فیصلوں میں وقت وقت سے تبدیلیاں برحق ہیں۔ اس نظر سے دیکھیے تو گزشتہ آٹھ صدیوں کے دوران مولانا نے (اپنی نسبی بزرگوں کے علاوہ) جن شخصیتوں کے مناروں کی بلندی دکھائی ہے وہ سبھی اپنے اپنے وقت کے مجدّد ہیں؛ مجدّد بھی وہ جو غیر اسلامی فلسفے کے مباحث اور اسلامی فلسفے (علم کلام) کی موشگافیوں سے تنگ آکر قرآن وسنّت کے دامن میں پناہ لینے اور متعیّنہ اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہ کر حالات حاضرہ کے مطابق احکام نافذ کرنے، سیاسی اور معاشرتی مسائل اور برتاو کی حد بندیاں کرتے ہیں نہ صرف عمریں بسر کر گئے بلکہ والیان حکومت کا سامنا کرنے میں جانیں کھپا گئے (مشروط طور پر) امام غزالی۔ (وفات ۱۱۱۱ء) اور غیر مشروط چاروں ائمہ فقہ وحدیث کے حرف آخر (امام ابوحنیفہ، شافعی، امام مالک بن انس اور احمد بن حنبل (۸ ویں نویں صدی عیسوی)، ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸ء) شیخ احمد سرہندی (وفات ۱۶۲۴ء) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات ۱۷۶۲ء) اور ان کے وہ سلبی و روحانی فرزند جنھوں نے تجدید اور احیاے دین میں تمام مخالفتوں کا سامنا کیا البتہ ان ناموں میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (وفات ۱۲۴۰ء) جیسے صوفیہ اور ابن سینا ابو نصر فارابی الکندی، بلکہ ابن طفیل اور ابن رُشد (۱۲ ویں صدی)، جیسے عالمی حیثیت کے فلاسفہ (قرونِ وسطیٰ کے مسلم سائنس دانوں) کا ذکر بھی برائے بیت آجاتا ہے۔ وہ تجدید کو احیاے دین متین کے مترادف

قرار دیتے ہیں اور یہاں تک پہنچتے ہیں:

"۔۔۔۔ اصل یہ ہے کہ مجدّدین امت کا ظہور بھی معاملاتِ نبوّت کے ماتحت ہے۔ جس طرح انبیاے کرام کی تعلیم و دعوت ہمیشہ اسی رنگ میں جلوہ افروز ہوتی ہے جس کا اُن کے عہد میں غلبہ ہو، اسی طرح مجدّدینِ امت کا ظہور بھی ہمیشہ اپنے رنگ روپ میں وقت کے مقتضا و داعیہ کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی امرا و سلاطین میں سے ظہور ہوتا ہے کبھی علما و اصحاب درس و تدریس میں سے، کبھی اصحاب سلوک و طریقت میں سے اور یہ تنوّع اس لیے ہوتا ہے کہ ان وقتوں کے حالات انہی بھیسوں کے مقتضی ہوتے ہیں اور چوں کہ غلبہ وقت کے رنگ کا ہوتا ہے اس لیے اور تمام رنگتیں اس کی چمک دمک کے سامنے پھیکی پڑ جاتی ہیں۔۔۔ عام طور پر شہرت و غلغلہ صرف ایک ہی معاملہ کا ہو جاتا ہے۔"
(وہیں ص ۲۶۴)۔

اسی حاشیے میں ایک ذاتی کیفیت کا ذکر بھی آگیا ہے:

"۔۔۔۔ سیرت حضرت مجدّد لکھتے ہوئے کچھ عجیب انشراح خاطر اور انبساطِ طبع بہم پہنچا جس کی کیفیت حدّ بیان سے باہر ہے اور یہ یقیناً اس ارادت و نسبت کا نتیجہ ہے جو حضرت ممدوح سے اِس عاجز اور اس عاجز کے خاندان کے تمام اکابر کو نسلاً بعد نسلٍ حاصل رہی ہے۔۔۔" (وہیں ص ۲۶۵)

تجدید اور احیاے دین میں وقت کے رنگ کا غلبہ اور مقتضاے حالات کا قبول کر لینا محض قرآن فہمی کی برکت ہے یا بنگال کی دہشت پسند انقلابی تحریک سے قریبی رابطے کی پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی اصلاحی قوم پرست لہر، جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد در شاگرد شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا جیسے اینٹی امپیریلسٹ پان اسلامیوں (PAN-ISLAMISTS)۔ (مسلم ملکوں کی آزادی پسند تحریکوں کو ایک لڑی میں پرو لینے) کی تاثیر ہے اور پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں رہی سہی خلافت عثمانیہ کی شکست اور

ہندستان کی اُس باغیانہ ہلچل کے آثار کا بھی اس میں کچھ اثر ہے جس کے بانیوں میں مولانا خود کو ۱۲۔۱۹۱۱ء سے شمار کرتے تھے ـــ یا یہ سب کچھ مل ملاکر؟ ہم نشاندہی کرسکتے ہیں قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے۔

"تذکرہ" کی تحریر اور ترجمان القرآن جلداوّل کی تصنیف ایک ہی دور کی ذہنی کاوش ہیں۔ روح دونوں میں ایک سی ہے۔ زبان مختلف "تذکرہ" وہ گویا کلاسیکی عربی فارسی میں سوچ سوچ کر لکھتے جاتے ہیں، مگر "ترجمان" تھم تھم کر جملوں کی ساخت کو اردو نثر کے مزاج سے قریب تر لاکر۔ اصطلاحوں کو چبا چبا کر، عام فہم بناکر "تذکرہ" ایک عزیز کی فرمایش پر لکھا جا رہا ہے "ترجمان" قلب ونظر کی تپش کو اوروں تک عام کرنے کی خاطر۔ بیان کے جسم وجاں کی یہ مطابقت ارادی ہے، اتفاقی نہیں۔ دوران کار ـــ انہی تین چار برسوں (دسمبر ۱۹۱۹ء ـــ ۱۹۱۶ء مارچ) میں مولانا پر چند نکتے ازسرِ نو کھلے ہیں جو "حیات سرمد" کی تصنیف کے وقت نمایاں نہ تھے (وہاں تو سرمد کے انکار اور افکار کے بجائے سیرت کی بے باکی وبے نیازی کے انگاروں سے سینہ تابناک رکھنا تھا)۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو کلکتہ میں ایک تاریخی خطبہ دیتے ہوئے وہ پان اسلام ازم کی دعوت کے تعلق سے یہ نکتہ اُبھارتے ہیں کہ مغربی سامراج، ایشیائی افریقی زمینوں پر قابض امپرلسٹ اقوام یورپ اس لہر کو اپنے غاصبانہ مفاد کی دشمن شمار کرتی ہیں اور اسی لیے متہم گردان کر مسلمانوں کو اس سے ڈرا رہی ہیں:

> "۔۔۔ سچ یہ ہے کہ ہم اپنے اصلی پان اسلام ازم کو کھوچکے ہیں اور یہی علّت اسلام کے اصلی صنعت وانحطاط کی ہے۔ مگر چوں کہ اس کا بیج اب بھی ہم میں موجود ہے، گو برگ وبار نہیں، اس لیے یوروپ چاہتا ہے کہ اس طرح کے انتشارات سے سہما اور ڈرا کر ہم کو آیندہ کی ہوشیاری اور بیداری سے بھی باز رکھے اور رہی سہی قوت کا بھی نشوونما سے پہلے خاتمہ کردے۔" (ص ۲۷، ۲۶)

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک کے شب و روز مولانا نے تصنیفی اعتکاف میں ہی بسر نہیں کیے وہ اخباروں اور آنے جانے والوں کے وسیلے سے باہر کی ہلچل سے آگاہ اور آیندہ کی دعوت و عزیمت کے لیے چشم براہ بھی رہے۔

یہیں انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ قرآن کا تعلق روزمرّہ کی زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ہے۔ وہ جتا چکے ہیں کہ "اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے" خلافت اسلامیہ و جزیرۃ العرب کی حفاظت و دفاع اور ہندوستان کی آزادی "کرۂ ارضی کی سب سے بڑی قاہر و جابر طاقت کے دہنِ آز سے اس کا نگلا ہوا لقمہ واپس لینا ہے۔"

۱۹۲۱—۱۹۲۰ء میں جب وہ رانچی سے کمر کس کر قومی تحریک کی اونچی اٹھتی لہروں میں کود دے، مجلس خلافت، جمیعتہ العلما اور انڈین نیشنل کانگریس کے کھلے اجلاسوں سے پے در پے مخاطب ہوئے (ملاحظہ ہوں خطباتِ آزاد۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۷۴ء) تو اُن کی نگاہ شروع کے پان اسلامی مرحلے سے آگے پڑ رہی تھی، اب وہ کچھ سوچ کر کچھ تجربہ کر کے اس نتیجے پر نہ صرف پہنچ چکے تھے، بلکہ اُسے رفت و گزشت کر آئے تھے کہ خود اپنی شخصیت کو (قومی مقصد آزادی کی خاطر ہی سہی، مگر) امام الہند منوائیں اس کے لیے بیعت لیں، مومنوں اور متّقی علما کے لیے حزب اللہ کی جماعت اور دار الارشاد کا درس (STUDY CIRCLE) قائم کریں اور خود کو مرکزی حیثیت دے کر قدم آگے بڑھائیں۔ اب فرد واحد کی جگہ وہ جماعت کا (خلافت کمیٹی اور جمیعتہ العلما کا) نام لیتے ہیں اور انہی سے کام بھی لیتے ہیں۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ ملک میں چوں کہ کوئی نظام شرعی موجود نہیں، اور مسلمانانِ ہند کا معاشرتی ڈھانچہ اور مرکزی اختیار ٹوٹ چکا ہے بکھر چکا ہے، لہذا:

"۔۔۔۔ ایسی حالت میں فی الحقیقت اگر منصب امامت کے فرض کو ادا کرنے کا کسی جماعت کو حق حاصل ہے تو وہ علما کی جماعت ہے، اہل بصیرت کی جماعت ہے ۔۔۔۔۔۔ اس جماعت نے (خلافت یا جمیعتہ العلما نے) کامل غور و فکر کے بعد، تمام حالات دیکھنے کے بعد اس امر کا فیصلہ کیا اور

اعلان کر دیا کہ اس وقت ہم نے اپنے فرائض شرعی کے انجام دینے کے لیے مطالباتِ خلافت کے پورا کر دینے کے لیے جو راہ اختیار کی ہے یہ راہ بلا قتل کیے اور بلا جنگ کیے ہے . . . ."

مولانا ۱۸ / نومبر ۱۹۲۱ء کو لاہور میں جمیعۃ العلماے ہند کے سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت دے رہے ہیں۔ ملک کو دو اہم تاریخی ہنگاموں کا سامنا ہے۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں سوراج اور خلافت کے دھاروں کو یکجا کرنے کا ایجی ٹیشن عدم تشدّد ("اہنسا") کے اصول کے سایے میں پھیل رہا ہے۔ ایک زبردست لہر آئی ہوئی ہے ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ قومی آزادی کی منزل تک پہنچنے کی۔ (اگرچہ مکمل آزادی کی تجویز اسی لاہور میں پورے آٹھ برس بعد پاس ہوئی) کانگریس، مسلم لیگ، جمیعۃ العلما اور خلافت کمیٹی سب کا رُخ ایک ہی طرف ہے۔

ایسے میں ساحل ملیبار (کیرالا) سے شور اٹھتا ہے — جیسے کسی جلسے میں کھلبلی مچ جائے کہ سانپ آیا سانپ — شور ہے موپلا بغاوت کا۔ ملباری مسلم کسانوں اور غریب ملازموں نے عدم ادائیگی ٹیکس کے جاں باز ایجی ٹیشن میں تشدّد اختیار کیا تو اس کا ایک بازو مالدار ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف اٹھ گیا کچھ مار دھاڑ ہوئی۔ سرکاری نیم سرکاری ایجنسیوں نے اسے خوب اچھالا (اور عین ممکن ہے، جیسے کہ مولانا نے "انڈیا ونس فریڈم" میں اشارہ کیا، اسی اچھالنے کی خاطر فتنے کو اندر سے اپنے دربردہ ایجنٹوں کے ذریعے اشتعال بھی دلایا ہو۔) مولانا ایک سیاسی ذہنی اور دینی رہنما کی حیثیت سے مسلمان، تحریک آزادی اور تشدّد کے سہ طرفہ تعلق پر دو ٹوک راے دینے کے مجاز بھی ہیں اور جواب دار بھی۔ وہ اس خطبے میں مسئلے کا ہر پہلو سے احاطہ کرتے ہیں:

" . . . اگر موپلاؤں نے خلافت کے مقصد کو لے کر تلوار اٹھائی اور جنگ کی تو اُن کا یہ عمل اس جماعتی فیصلے کے خلاف تھا جو ہندستان کے علما نے کیا ہے۔ اس لیے یقیناً ان کو ملامت کی جا سکتی ہے . . .

اگر وہاں کے مسلمانوں نے محض اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے یا اُن سے (ہندو ہم وطنوں سے) انتقام لینے کے لیے ظلم و جبر کرکے مسلمان بنانا چاہا ہے تو ہم میں سے ہر شخص جسے شریعت کا علم ہے اس کا اعلان کرے گا کہ ۔ ۔ ۔ ان کا ایسا کرنا شریعت کا عمل نہیں ہے بلکہ شریعت کی توہین ہے ۔ ۔ ۔

اگرچہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ تشدّد کریں، لیکن وقت کی ضرورتوں کو دیکھ کر انھوں نے اس عقیدے کو ملتوی کردیا ہے ۔ ۔ ۔ تشدّد تو اسلام کے نقطۂ فکر سے کسی حالت میں جائز نہیں ہو سکتا ۔ تشدّد کا حکم اسلام نے کسی حالت میں نہیں دیا ہے ۔ جنگ کا حکم دیا ہے جب کہ جنگ عدل قائم کرنے کے لیے ہو ۔ ۔ ۔

اس بڑی جماعت نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو اعلان کیا ہے اس کی بنا احکام شریعت پر ہے (خلافت کی خاطر بلاتشدد تحریک چلانا) اس کی بنیاد بھی نظام شریعت پر ہے ۔ محض ایک فرد یا ایک جماعت کی راے نہیں ہے ۔ ۔ ۔

اگر موپلاؤں نے ان ایام میں تلوار اٹھائی تو ان کا یہ فعل ہماری اس جماعت کے فیصلے کے خلاف ہے ۔ ۔ ۔ (ص ۵۳ - ۱۴۴)

ہندستان کی تحریکِ آزادی کے اس سنکٹ میں مولانا کا یہ خطبۂ صدارت (اور اسی کے ساتھ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کے تمام صدارتی خطبات) نہ صرف اُن کے ذہنی سفر کے سب سے اہم مرحلے دکھاتے ہیں بلکہ خود قومی تحریک اور قومی ذہن یا نفسیات کی پیچیدگیوں پر بھی ہماری آنکھیں کھولتے ہیں ۔

مولانا نے اِن خطبات کے ذریعے، گویا، کھلے لفظوں میں جتا دیا کہ وہ شرعی احکام اور فقہی فیصلوں کو جامد نہیں مانتے ۔ امام یا مجدّد کے موجود یا مُسلّم نہ ہونے پر علما اور اہلِ بصیرت کی جماعت گردوپیش کے حالات کی روشنی میں فقہی فیصلے کر سکتی ہے اور کرتی رہی ہے ۔ یہ قرآن اور شریعت کا CONTEXTUAL INTERPRETATION

ہے۔ اسے ایک سمت میں کھینچیں (جیساکہ تنگ نظر مخالفینِ ابوالکلام نے کھینچا بھی) تو یہ تفسیر بالرّاے کی زد میں آئے اور دوسری سمت، تو یہ شارع علیہ السلام کے مقصد ومنشا کے مطابق تجدید و اجتہاد کا عمل کہلائے۔

"الہلال" کے اداریوں کو، جو مولانا کی نوجوانی اور دورِ شباب کے جوشیلے اور خودسر دور کی نشانیاں ہیں، ایک طرف چھوڑ کر بعد کی تصانیف کو دیکھیں۔ ترجمان القرآن کی دو جلدوں کا پہلا مسوّدہ رانچی سے نکلتے نکلتے تیار تھا (۱۹۲۰ء) اور تیسرا میرٹھ جیل میں (۳۱ - ۱۹۳۰ء) تکمیل کو پہنچا۔ "تذکرہ" میں جہاں مولانا نے ذاتی سوانح اور اپنے بزرگوں کا مختصر حال درج کیا ہے، وہ ایسی اردو میں ہے جو ۱۹ویں صدی تو کیا، خود "فسانۂ عجائب" سے پہلے کی شمار کی جائے۔ "تذکرہ" میں بعض مقامات پر اردو سے زیادہ عربی، فارسی حاوی ہے۔ "ترجمان" کی جلد اوّل، سورۂ فاتحہ پر قرآنی لب و لہجہ کے علاوہ تفسیری وضاحت اور تبلیغی جوش کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے ـــــ مگر اب لبالب قومی جلسوں کو جابجا خطاب کرنے کے ساتھ اور اس کے بعد پہلی مکمل خلوت میسر آتے ہی ایسی سلیس عبارت وہ لکھتے ہیں کہ اس دل نشیں اور بے تکلّف طرز میں ذاتی خط لکھنا بھی دشوار ہو۔

"ترجمان" پر کام کرنے کے دوران اور بعد میں قومی جلسوں کو (صرف مسلم حاضرین کو نہیں) خطاب کرنے اور للکارنے میں تفہیم اور تبلیغ کے مقصد سے اپنے طرزِ بیان کو خوشگوار اور عام فہم بنانے میں مولانا نے حیرت انگیز تبدیلی کا ثبوت دیا۔ جینیئس کی ایک ـــــ پہچان یہ بھی ہے) اسلوب میں یہ نمایاں فرق ان کے ذہنی سفر کا محض ایک واضح رُخ ہے۔ یہ تبدیلی "غبارِ خاطر" کے خطوط میں کہیں کہیں اور عام اجلاسوں کے خطاب میں ہر مقام پر اُبھر کر آتی ہے۔

یہاں بہتر ہو کہ ہم مولانا کے طرزِ بیان (تحریر) کے بنیادی نکتے کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ جس طرح چشتی صوفیہ نے سماع کے لیے، گویا لحن و موسیقی کو مجلس میں عام کرنے کے لیے تین شرطیں رکھی تھیں: مکان، زمان اور اخوان ـــــ جگہ شارعِ عام سے ہٹ کر

وقت سکون و عبادت کا اور مجلس اہلِ دل کی ہو، تب سماع مناسب ہے۔ مولانا کے اسلوب کو (جسے واحد کے بجائے جمع میں " اسالیب " کبھی الزاماً کہا گیا ہے) وسعت اور قبول عام اختیار کرتے ہیں ان تینوں کے علاوہ چوتھا ذاتی منشن کبھی پیشِ نظر رکھنا تھا: امکان یعنی اوّل یہ کہ کس مقام پر تقریر کرنی ہے، یا کس مقام کے لیے، کس خاص موقع یا تقریب ("زمان") کے لیے لکچر یا خطبہ تحریر کرنا ہے اور کون لوگ (اخوان، پڑھنے یا سننے والوں میں ہوں گے، اس کے علاوہ یہ بھی کہ خطبے یا تحریر کی غرض یا امکان کیا ہے؛ کسی ریزولیوشن کی تحریک کرنی ہے، تائید کرنی ہے، تائید حاصل کرنی ہے، اختلاف دور کرنا ہے یا طے شدہ تجویز کو بیان سے قوت دینی ہے، اُسے ایمان کے درجے تک پہنچانا ہے۔ غالباً یہ چاروں پہلو اُن ذہنی تاروں میں دھیمے سُر بن کر اُتر آئے ہوں جن سے ابوالکلام کی نثر کا نغمہ پھوٹتا تھا اور ایسا پھوٹتا تھا کہ حسرتؔ موہانی نے اپنی نظم پر نثر ترجیح دی اور مہدیؔ افادی نے اُسے قرآنی آہنگ کا اردو روپ بتایا۔

البتہ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مولانا کی مادری زبان عربی تھی۔ اوّل کی ذہنی زبان بھی عربی۔ آبائی زبان دہلوی مگر مخلوط اردو۔ ماحول کی بنگلہ اردو۔ مطالعے کی زبانیں انگریزی، فارسی، ترکی اور کسی قدر فرنچ۔ مجلس جو ملی (جسے بمشکل حلقۂ احباب کہا جاسکے) وہ بیشتر انگریزی والوں کی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ابوالکلام کے اسلوب بیان یا طرزِ تحریر میں ارتقا کی رفتار ناہموار مگر اُن کے ذہن کی طرح بہت تیز نظر آئے گی۔ ناہموار اس معنی میں کہ بیک وقت وہ گاندھی جی سے اور (غیر اردو داں) کانگریس ورکنگ کمیٹی سے مخاطب ہیں، سیاسی کارکنوں سے بحث تمحیص کررہے ہیں یوپی اور پنجاب اور بنگال کے ڈیلی گیٹوں کی مقامی لب و لہجہ والی زبانوں سے کانوں کے پردے سینک رہے ہیں، اور دوسری طرف خلوت خانۂ شب میں کلاسیکی علم و ادب کا مطالعہ کررہے ہیں اور بعض اوقات اپنے دائیں بائیں مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، اجمل خاں، آصف علی، بھولا بھائی ڈیسائی، قاضی عبدالغفار اور عزیز ترین ہمراز جواہر لال نہرو سے

بے تکلفانہ اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے بیانات میں جو قولِ فیصل (۱۹۲۲ء) سے لے کر "غبارِ خاطر" کے خط ۸ (باورچی کا چٹ پٹا ذکر) اور خط نمبر ۲۴ (موسیقی کے رموز و آثار پر) تفصیل اور یکسوئی کے ساتھ آئے ہیں، بلکہ جُداگانہ فضا، مختلف موڑ، اور قطعی علاحدہ قسم کی لفظیات ملتی ہیں۔ وہ بعض محاورے بھی (مثلاً کر دی جاسکتی ہے، کر لی جاسکتی ہے، تبلائے گا) اہل زبان کی روش سے ہٹے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غبارِ خاطر" میں اکثر انھوں نے پر لطف، پُر مذاق مگر نہایت جچی تُلی ذہنی زبان اردو برتی ہے "ترجمان" میں اندازِ خطابیہ اور تفہیمی بلکہ کہیں کہیں تدریسی ہو گیا ہے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کے کانگرس سیشن کے صدارتی خطبے حتمی اور ایجی ٹیشنل قوت رکھتے ہیں اور چھوٹی علمی مجلسوں میں مخاطبین کی ذہنی سطح اور ضرورت وقت کے مطابق تقریر و تحریر سے کام لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن حضرات کو ادبِ عالی کے اسالیب کی جنٹر بنیادسے آگہی نہیں وہ مولانا کو صاحب اسلوب نہیں مانتے عذر یہ کہ وہ کئی کئی اسالیب سے کام لیتے تھے، کسی ایک سے نہیں۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں ادھر "چوری چورا" کے واقعے کے بعد گاندھی جی نے اہنسا نمک آندولن پر زبردست جھٹکے سے بریک لگایا اور اُدھر ترکی میں "ینگ ٹرکش" "نئے کان احرار کے لیڈر اتا ترک مصطفےٰ کمال نے خلافت عثمانیہ کا فرسودہ ڈھانچہ اٹھا کر باہر پھینکا ــــ ایک ساتھ دو المیے، خلافت اور سوراج کے فدائیوں کے لیے ــ ع ملتی نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے۔

۱۹۲۳ء تمام ہوتے ہوتے نادان ہندو مسلمانوں کی آستینیں چڑھ گئی ہیں، مشترک دشمن کے خلاف نہیں، ایک دوسرے کے خلاف کل کے حلیف، آج کے حریف۔ یہی مناسب موسم ہے کہ "شُدھی" اور "تبلیغ" کے پرچم لہرائے جائیں اور آمنے سامنے دشنام طرازیوں کے پنڈال سجائے جائیں۔ تاریخ ہند میں پہلی بار ہندستان گیر فرقہ وارانہ فسادات اور ان کا بدبودار پروپیگنڈا۔

محمد علی، شوکت علی خاں، محمد علی جناح، مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے، ایم ایس اینے،

بھائی پرمانند اور بالآخر ظفر علی خاں ــــــ کم و بیش کانگریس بددل ــــ مسلمان بدگمان۔

ایسے وقت میں ابو الکلام کا ذہن کتنی آنچ پر ہے ؟

"۔۔۔۔ حضرت مسیح نے دنیا سے کہا کہ دشمنوں کو بخش دو۔ مگر دنیا آج تک دوستوں کو بھی بخش نہ سکی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک طرف انتقام اور مقابلے کا جذبہ مشتعل کرکے، دوسری طرف محبّت و اتحاد کا کارخانہ بھی قائم رکھیں ؟

اسی طرح میں شدّھی کی تحریک کی نسبت عرض کروں گا کہ اگرچہ ہم کاغذ پر سیاست کی متحدہ تحریک اور مذہب کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دو مختلف خانوں میں رکھ سکتے ہیں لیکن عمل میں کوئی ایسی تفریق قائم نہیں رہ سکتی۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ہندستان میں ایک طرف سے ملیچھ اور دوسری طرف سے کافر کی صدائیں اٹھتی رہیں گی تو محال ہے کہ وہ رواداری پیدا ہو سکے، جس کے بغیر اتحاد کا وجود قائم ہی نہیں رہ سکتا"

(انڈین نیشنل کانگریس۔ دلّی ۱۵ دسمبر ۲۳ ۱۹ء ص ۲۰۹)

مولانا کے لیے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ مذاہب، فرقوں، نسلوں اور طبقوں کو ایک عام قومی دھارے میں آبشار کی طرف بہائے لے جانے والی تحریک پر گاندھی جی نے بھاری پتھر رکھا تو برطانوی حکمت عملی نے مخالف سمت میں موڑ کاٹ دیے۔ خوابوں کے خیموں کی طنابیں اُکھڑنے لگیں۔ جنوب میں موپلا بغاوت اور حوصلے بڑھانے کا الزام قومی رہنماؤں پر اس کے فوراً بعد کوہاٹ، ملتان اور پھر ایک سلسلے سے فرقہ وارانہ فسادات شدّھی اور تبلیغ۔ تشدّد کے جواب میں تشدّد۔ اور دونوں فریقوں پر برطانوی حکومت کا بے رحمانہ تشدّد۔

یا تو یہ حال تھا کہ خلافت کے پُرجوش رہنما خود ہی آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی میں محراب و منبر تک لے گئے اور وہاں اُن سے تقریر کرائی یا چند

روز بعد وہی ملکانہ راجپوتوں کو واپس ہندو دھرم میں لانے کے مجرم اور دشمن نمبر ایک قرار پائے ۔

ابوالکلام نے نہ تو گاندھی جی کو مہاتما اور نجات دہندہ کے اور ایک سے ایک مبالغہ آمیز خطاب سے نوازا تھا، نہ وہ سوامی جی کے اس درجہ معتقد تھے کہ دو برس کے اندر ہی (محمد علی اور شوکت علی کی طرح) ایک انتہا سے دوسری انتہا پر اُتر جاتے۔ ایک دردِ مشترک میں مبتلا تھے، منزل پہلے سے دور ہوگئی تھی ۔ دائیں یا بائیں طرف جھکاو برسوں کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتا۔ دم سادہ کر بیٹھنا بھی غلط ہوتا وہ خود آگرے گئے اور ملکانہ راجپوتوں کو ہندومت میں پھیر لانے کے واقعات کی تحقیقات کرنے کے بعد اخباروں کے نام بیان جاری کیا :

" ۔ ۔ ۔ ہر انسان حق رکھتا ہے کہ اپنے اعتقاد کی طرف دوسروں کو دعوت دے اور جس اعتقاد کو حق سمجھے اپنی پسند اور اپنی مرضی سے قبول کرے ۔ یہ انسان کا قدرتی اور پیدائشی حق ہے ۔ اگر ملکانہ راجپوتوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی پسند اور مرضی سے ہندو قوم میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ضرور انھیں حق حاصل ہے ۔ جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے مسلمانوں کے لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس بات پر معترض ہوں ۔ ان کے لیے صرف ایک ہی بات صحیح اور برمحل ہوسکتی ہے کہ وہ بھی اپنا مذہبی فرض انجام دیں اور ملکانہ راجپوتوں کو اسلام میں مضبوط اور مستقل بنانے کی کوشش کریں ۔ اپنے کام سے غفلت کرنا اور قدرتی نتائج پیدا ہوں تو دوسروں کا گلہ کرنا نہ تو دانائی کی بات ہے نہ عزّ و شرف کی ۔ میں پورے وثوق کے ساتھ رائے رکھتا ہوں کہ جن لوگوں نے موجودہ وقت میں یہ تحریک شروع کی انھوں نے ملک کا عام مفاد نظر انداز کر دیا ۔ ۔ ۔ "

(تبرّکات آزاد ص ۱۷۳ بحوالہ " سیاسی ڈائری ")

معاملات کا ایک تیسرا رُخ بھی تھا جہاں مولانا کے دل و دماغ کی آزمائش لازم تھی — اور یہ تھی سُنّی شیعہ اور سُنّی سُنّی عقائد کی آویزش لکھنؤ بریلی دیوبند کے مرکزی مقامات پر۔ امیر عبدالعزیز بن سعود نے حرمین (مکّہ و مدینہ) پر تسلّط حاصل کرتے ہی خُلفا، ائمہؑ، اصحاب اور اہل بیت کی قبروں کی عمارات گرانی شروع کر دیں کہ وہ لوگ اسے قبر پرستی اور شرک قرار دیتے ہیں۔

ابوالکلام قبر پرستی کے ماحول میں پلے، اس سے مُنکر ہوکر وہ حنفی عقائد اور عادات کے نکتہ چیں ہوئے۔ عقلیت کی جانب گئے، پھر " وہابیت " کے حامی ہوئے، اب قومی رہنمائی کی صف اوّل میں تمکّن حاصل ہونے کے بعد انھیں بیک وقت کئی کئی عقیدوں ازموں اور فرقوں سے نبٹنا ہے۔ موقع پرستی کی بھی اتنی ہی گنجائش ہے جتنی عقیدے اور عمل کو آنچ دکھانے اور ایک سانچہ ڈھالنے کی۔ مولانا یہاں دونوں فریقوں کے بُرے بنے۔ انھوں نے دلائل کے ساتھ بتایا کہ اگر کسی مقدّس ہستی کی (جس میں پیغمبر شامل ہیں)، کوئی یادگار اس درجے کو پہنچ جائے کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگیں اور اس سے مُرادیں مانگنے لگیں تو اس یادگار کو نابود اور ناپید کر دینا بھی لازم ہے۔ " بزرگوں کی سچّی تعظیم یہ نہیں ہے کہ ان کی یا ان منسوبات کی پرستش کی جائے یا ایسی باتیں کی جائیں جو پرستش کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ایسا کرنا تعظیم کی جگہ بے احترامی ہے اور اس کا ازالہ مقتضائے تعظیم و محبت ہے نہ کہ اس کا ابقاء۔ خود آں حضرت نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل وغیرہم انبیائے کرام کے مجسّمے خانہ کعبہ میں، توڑے اور حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک سے تڑوائے۔ یہ اُن انبیا کی تعظیم تھی بے احترامی نہ تھی " (اس سلسلے کے مضامین مولانا نے بقول مصنف " ذکرِ آزاد " خود اپنے نام سے شائع نہیں کرائے بلکہ مولانا ملیح آبادی کے نام سے چھپے۔ تصنیف مذکور (ص ۶۰-۴)۔

اُنہی مولانا ملیح آبادی کا بیان ہے کہ ابوالکلام نے ان کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

" . . . حدیث انسانی سوسائٹی کے لیے قانون کا سوتا نہیں ہو سکتی۔
عالمگیر ہدایت کا ضامن قرآن ہے اور قرآن معدودے چند قوانین
کا حامل ہے۔ یہ اس لیے کہ کوئی قانون بھی اختلافِ ازمنہ و حالات کی
وجہ سے ساری دنیا پر نہ نافذ ہو سکتا ہے، نہ مفید ہو سکتا ہے۔
دراصل شریعت کی اساس جلبِ مصالح اور دفع مفاسد پر ہے۔"

آج ہم پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ اُن برسوں میں حرمین اور دوسری زیارت گاہوں میں "قبور کا فتنہ"، خود ہندستانی مسلمانوں کے درمیان کس درجہ آگ پکڑ گیا تھا (وہی حالت تھی جو ہمارے زمانے میں "مسلم پرسنل لا"، اور بابری مسجد کے سلسلے میں دیکھی جاتی ہے۔ ظا)

اسی زمانے میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی بعض تحریروں کے سبب اردو پریس میں ہیجان برپا ہوا اور کفر کے فتوے شائع ہونے لگے۔ لاہور اس ہنگامے کا مرکز تھا (علامہ اقبال جیسا عالی ظرف اور وسیع النظر "حکیم امت" بھی قادیانیوں کی تکفیر کے مرض میں مبتلا تھا)، مولانا ابوالکلام پر استفسارات کی بھرمار ہوئی لیکن انھوں نے انتہائے ضبط کے ساتھ اس مسئلے پر جو تفصیلی نوٹ لکھے اور زبانی ہدایات دیں، وہ گواہ ہیں کہ کفر و ایمان کے نزاع میں مولانا کی نظر کس قدر بلند ہو چکی ہے:

" . . . . خوارج بھی تمام مسلمانوں کی تکفیر کرتے تھے مگر حضرت علیؓ
کا فتویٰ مشہور و معلوم ہے انھوں نے جمعہ کے دن خطبے میں فرمایا کہ
گو تمھارے عقائد اس طرح کے ہیں، لیکن جب تک تم قبلے کی طرف
مُنہ کر کے نماز پڑھتے ہو، میں تمھیں مسلمانوں سے خارج نہیں
کروں گا . . ." (وہیں ص ۲۶۶)

یہ نہیں کہ مولانا رائے عامہ سے بے نیاز ہو کر اپنی قطعی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ قومی اور سیاسی لیڈر کے ناطے انھیں معاملات کے مختلف پہلو نظر میں رکھنے پڑتے تھے لیکن "خوفِ فسادِ خلق" سے ان کے برملا اظہار میں احتیاط کرتے تھے۔

مثلاً مولانا ملیح آبادی نے جو ذاتی زندگی کے چند واقعات درج کیے ہیں اُنہی میں "کتا پالنے" کا واقعہ شامل ہے۔ مولانا نے گھر پر کتا پالنے کی تجویز اس ریمارک کے ساتھ بادلِ ناخواستہ منظور کر لی کہ:

"۔۔۔۔ مولوی صاحب، آپ مجھے کیوں کیچڑ میں گھسیٹنا چاہتے ہیں! ہندستان بھر کا مولوی بکبلانا شروع کر دے گا کہ دیکھو، آزاد بھی کتے پالنے لگے"
(وہیں ص ۳۲۰)

اس ایک لفظ "بکبلانا" میں خود مولانا ابوالکلام کے ذہن اور عام "مولویانہ ذہنیت" کا فرق ایک شوخی کے ساتھ ہمارے سامنے کھل جاتا ہے۔

ترجمان القرآن کی تیسری جلد ۱۹۳۰ء اور اس کے فوراً بعد کی تحریر ہے اور شاید فرصت کے ساتھ اس حقیقت کا مطالعہ ابھی نہیں کیا گیا کہ ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی سرہندی کے ایک معتقد کے قلم سے اس تیسری جلد کے بعض مندرجات کیوں کر نکلے (اس پر ہم ایک جداگانہ مقالہ لکھنا چاہتے ہیں۔ ظا) یہ تبھی ممکن تھا جب وہ خود شاہ ولی اللہ کی لائن سے بھی دو قدم آگے نکل گئے ہوں۔ مولانا نے بعد کی تحریروں، خصوصاً "غبارِ خاطر" کے خطوط میں (جو بہر حال آیندہ کسی وقت اشاعت کی خاطر لکھے گئے) اپنے ذہن کی اس وسعت اور گہرائی کو ظاہر کر دیا ہے جو مغربی ادب، خصوصاً فلسفہ و تاریخ کے سنجیدہ مطالعے کی بدولت اور غیر مذاہب، مختلف عقائد و رسوم و عادات و آداب کی مستند شخصیتوں سے ملتے تبادلۂ خیالات کرنے اور از ابن تیمیہ تا سید اسماعیل شہید شدت پسندانہ (مجاہدانہ!) خیال و عمل پر برابر نظرِ ثانی کرتے رہنے کے سبب انھیں نصیب ہوئی۔

اپنے عقائد پر نظرِ ثانی کرتے رہنے کی متعدد مثالیں ابوالکلام (جیسے ضدی شخص) کے ہاں ملتی ہیں۔ اور خود ہی اس کا اعتراف بھی کرتے گئے ہیں۔ یہاں صرف ایک جو ہر اعتبار سے اہم ہے:

اکبر اعظم کے ایک راسخ العقیدہ درباری منصب دار عبدالقادر بدایونی کو مولانا

شروع سے بہت مانتے تھے "تذکرہ" میں جا بجا اس کی "منتخب التواریخ" کے حوالے ملتے ہیں اور یہ بھی کہ :

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدایونی اپنے جوش حق گوئی اور اضطراب راست بیانی میں کسی بات کی پروا نہیں کرتے ۔ ۔ ۔" (ص ۳۹)

لیکن اب ملاحظہ ہو ۱۹۴۳ء کے خط ۱۷ میں اسی بدایونی کے باب میں بے تکلف فرماتے ہیں:

" اس کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز ابھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے ۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبرّا کی دعوت دیتی ہے ۔ ۔ ۔"

(ص ۱۸۶ غبار خاطر۔ دہلی اڈیشن)

مولانا کے ذہنی سفر میں "تذکرہ"، "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کے بعد اگر کوئی سنگ میل ہے تو وہ قومی اجلاسوں میں اُن کے خطبوں کے بعض ٹکڑے اور کمیٹیوں یا علمی مجلسوں میں اُن کے مختصر ریمارک جو تقریباً بیس برس کی مدّت پر محیط ہیں ۔

مارچ ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ اجلاس میں جب مولانا دوسری بار — اور تاریخ کانگرس میں سب سے طویل، سب سے فیصلہ کن (ساڑھے چھے برس) دور کے لیے صدر چنے گئے ان کا خطبۂ صدارت اپنے وقت میں (تقسیم ہند سے پہلے) جس تاریخی تہذیبی اہمیت کا حامل تھا آج بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ۔ اس کے حوالے اور اقتباسات جا بجا آتے ہیں (ہم نے آخری صفحات میں چند جملے لیے ہیں) اس کے یہ چند بنیادی نکتے نچوڑ کی حیثیت رکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ آخری قافلہ جو ہندستان میں پیروانِ اسلام کا داخل ہوا۔ اس کے رسنے بسنے کے بعد سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کردیا ۔"

"۔۔۔ یہ سرزمین اپنے ذخیروں سے مالامال تھی، ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اُسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔"

(مولانا نے یہاں "پیام" کا لفظ ہی لکھا ہے جیسا کہ کوئی بیس برس پہلے انھوں نے لفظ "پیغام" کو پیام پر یہ کہہ کر ترجیح دی تھی کہ اس کی صوتی کیفیت زیادہ شاندار ہے۔):

"ہماری گیارھویں صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔۔۔۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جُلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔"

اس خطبے کو بار بار پڑھتے، غور کرنے سے کھلتا ہے کہ مولانا نے کس خوبی کے ساتھ تاریخ کے عمل اور جغرافیہ کی اثر پذیری اور اثر اندازی کو باہم دگر پیوست دیکھا اور دکھایا ہے۔ "پیروانِ اسلام کا قافلہ" اس کا ہندستان میں وارد ہونا، پرانے ہندستان کی جگہ نئے ہندستان کا ڈھلنا، جُغرافیائی مقام کی تبدیلی کے ساتھ تمدّنی تغیّر اور تاریخ کا سفر — تہذیب کے عمل میں ان دونوں کا دخل اور اس دخل کا قدرتی امر ہونا، ایک مشترک سرمایہ بننا — چند جملوں میں مولانا نے جہانِ معنی سمو دیا ہے۔

اور دوسری نہایت اہم تحریر وہ خطبہ ہے جو مولانا نے ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں عربی نصاب کمیٹی کے سامنے دیا۔ پورے کا پورا خطبہ کئی بار مطالعے کے قابل ہے خصوصاً عربی اہل علم کے لیے۔ درس قدیم اور فلسفۂ تاریخ جدید میں تیرا ہوا ایک غیر معمولی دماغ اُن مراحل کا پتہ دے رہا ہے، اُن پر نکتہ چینی کر رہا ہے جن سے

وہ گزر چکا اور آج کے حالات میں، علوم عربیہ و اسلامیہ کی تنقیح کرتے وقت خود اپنی ذہنی استعداد اور رسائی کا نشان بھی نادانستہ دیتا جا رہا ہے۔ یہ ایک مفصّل خطبہ ہے جس کے چند نکتے آج کے ہند و پاک میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں:

"۔۔۔ ہر علم تین مختلف دوروں سے تین مختلف منزلوں سے گزرتا ہے پہلا تدوین کا، ایک ایک اینٹ چُنتا عمارت اٹھانا۔ دوسرا تہذیب کا، یعنی ترمیم، اصلاح، سنوار، ترقی۔ تیسرا دور بلوغ اور تکمیل کا کہ اب کوئی کمی نہ رہی۔ اس کی اشاعت اور پھیلاؤ ہونا ہے۔ اسلام پر بھی یہ تینوں دور گزرے۔

تیسری صدی ہجری کا زمانہ "تدوین علوم" کا، تیسری سے پانچویں صدی ہجری تک کا زمانہ تہذیب علوم کا، جو علوم مدّون ہو چکے تھے ان کی سنوار اور ترقی، بعد کا دور ساتویں صدی ہجری تک اشاعت کا۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، ساتویں صدی ہجری کے بعد علوم و فنون کا درخت مُرجھانے لگتا ہے۔ "نظر و اجتہاد" غائب ہو جاتا ہے۔"

جو علوم تب تک مدّون اور مکمّل اور ضخیم و وسیع ہو چکے تھے، وہ اپنے وقتوں میں مکمل اور کارگر تھے، وقت کی رفتار کے ساتھ اُن کی اہمیت جاتی رہی۔

" ہندستان میں اوّل ہی روز سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی وہ تنزّل کے دور کا نتیجہ تھی۔ ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔" (وہیں ص ۳۱۶)

"۔ ۔ ۔ کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو، جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہیے کہ زمانے کی جو چال ہے وہ اس کے ساتھ جُڑ سکتی ہو۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ رکھیے گے تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

" زمانہ چلتا رہا اور ترقی پر پہنچ گیا اور آپ وہیں رہے جہاں تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہمارا فرض تھا کہ ہم زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے مگر ہم نے زمانے کا ساتھ نہیں دیا"۔
" اور زمانے نے آپ کے خلاف آپ کو نکما سمجھ کر فیصلہ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ "
(ص ۳۲۱)

یہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد خطبۂ صدارت کے وہ نکتے ہیں جو آج بھی غور طلب ہیں۔ ۴۷ء کے بعد مولانا پوری طرح جلوت وخلوت میں تقسیم ہو گئے۔ وقت کی شدید پابندی کے ساتھ (جس میں جرمن اور انگریز بھی اُن سے شرماتے) وہ دفتر جاتے، وہ ۵، ۷ گھنٹے روز فائلوں، تجویزوں اور فیصلوں میں سر کھپاتے اور دن چھپے اپنی خلوت گاہ میں، اپنی دانش گاہ میں سمٹ جاتے " غبارِ خاطر " اور چند خطوط کے مجموعے " کاروانِ خیال " کے بعد ان کی املا کرائی ہوئی وہی ایک داستانِ آزادی رہ جاتی ہے جو انڈیا ونس فریڈم (INDIA WINS FREEDOM) کے نام سے نکلی اور جس میں غیر سیاسی یا علمی مسائل کا نزاعی بیان، اختلاف انگیز بیان مولانا کی باقی تمام تصنیفوں اور تحریروں پر بازی لے گیا۔ مگر وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

اکادمیوں اور کمیٹیوں میں، جہاں اردو داں کم ہی ہوا کرتے تھے، مولانا بعض اوقات اتنی سلیس و نفیس زبان بولتے کہ ریکارڈ ہونے کے بعد اعلا درجے کا نثر پارہ دکھائی دیتی۔ ایسی ہی ایک مختصر مگر ہوشمند مجلس میں، جہاں ایک کلچرل ادارے کا سنگِ بنیاد رکھا جانا تھا۔ مولانا نے تاریخ کے پُراسرار اور حتمی عمل کو یوں بیان کیا۔ (تو میرے بھائی) ہر زمانے میں ترازو وہی رہے مگر باٹ ضرور بدلے جاتے ہیں۔ مُوزل اور عمل اور پرکھ کے باٹوں کا بدلا جانا نیچرل ہے۔ اور انھیں باٹوں کی مقررہ تول سے ہمارے فیصلوں کا بھی حساب کیا جاتا ہے۔ ۔ ۔ " گویا ان الفاظ میں مولانا نے TRANSVALUATION OF VALUES کے عمرانیاتی (سوشیالوجیکل) اصول کو روشن کر دیا۔
اُن کی آخری تقریر جو آل انڈیا اردو کانفرنس میں ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو ایک

بڑے مجمع اور جواہر لال نہرو کی اہم شرکت کے ساتھ ہوئی، یقیناً ایک سیاسی پہلودار تقریب تھی۔ اردو تحریک اور مولانا کے تعلق سے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

۳

مولانا ابوالکلام کی ستّر برس پر پھیلی ہوئی زندگی میں کم از کم پچاس سال بیسویں صدی کے اوّل نصف پچاس مسلسل جستجو میں، ردّ و قبول میں بسر کیے۔ کہا جاتا ہے کہ قریب ترین لوگ بھی ان کے خلوت کدہ ("بسم اللہ کے گنبد") میں دخیل نہ ہو سکے لیکن الفاظ جو ذہنی خلوت سے باہر آئے، تحریر و تقریر کی صورت میں وہ ان کے بلند بانگ رازدار ہیں اور اُنہی کی زبانی ہم ان نتیجوں پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے۔

جو مولوی محی الدین احمد المکیؒ یا بی الکلام پیری مُریدی عُرس اور قُل و قوالی کے تقلیدی ماحول سے اس درجہ بیزار تھے کہ اپنے محترم باپ کے مزار پر کبھی نہ گئے، ان کے عرس میں شریک نہ ہوئے —— وہی ابوالکلام عمر کے وسط میں اس نتیجے پر پہنچے کہ غیر شخصی تصوّر سے خدا پرستی کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ضروری ہے کہ فکر انسانی کے سامنے ایک چیز لائی جائے لوگ کوئی نہ کوئی صورت سامنے دیکھیں۔ ویدانتی توحید، وجودی اور بودھ مت کا نفی صفات (ATTRIBUTES) کا تصوّر فلسفے کا ایک مذہب بن گیا، انسان کا عملی مذہب نہ بن سکا۔

"عملی مذہب کے لیے اصنام پرستی اختیار کرنی پڑی۔"

(میرا عقیدہ بحوالہ مقالہ اع ارشد ص ۴۵۵)

وہی ابوالکلام جن کی روح میں شاعری، حسن پسندی، جمالیاتی کیفیت اس درجہ رسی بسی تھی کہ ترجمان کی بعض عبارتوں پر تحقیقیوں کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ شاعری ہے یا تفسیر

" WAS IT THE QURAN OR THE POET THAT GAVE HIM THIS IDEA "

(مرحوم پادری ڈوگلاس کی تصنیف ۱۹۸۸ء آکسفورڈ پریس ص ۲۵۹)۔

اسلامی یادگاروں کے انہدام کے حامی بالآخر موسیقی اور شاعری اور پیکر تراشی اور مصوّری کے درمیان حسن کے مرکز کی مدّاحی کھلے بندوں کرتے ہیں۔ خود ستار سیکھنے

اور خلوت شب کو موسیقی پرور آوازوں سے شاداب کرنے کے اقراری ہیں۔

خوشبو، آوازِ خوش، تصویرِ خوشگوار، روے زیبا، شعرِ نغز — اور فکرِ رسا ان کے محبوب ہیں:

"۔۔۔۔ آسمان سے ستارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔"

اِبن تیمیہ — بلکہ ان سے پیشتر امام غزالی سے لے کر دورِ آخر کے اہل دیوبند تک ۸ صدی کے دوران جو رجحان اور مشغلے مکروہ شمار ہوئے اور جن میں غیر اسلامی فکر و فلسفے کے مباحث شامل ہیں، مولانا ان سے عمر کے آخری زمانے تک بہرہ ور ہوتے رہے۔ خلوت شب میں جب ان کی خوابگاہ کا (جو اسٹڈی بھی تھی) دروازہ جو دنیا بھر کے لیے بند رہتا تھا، کمرے کی کھڑکیاں تمام ملکی اور غیر ملکی رجحانوں، بحثوں اور مسائل کی طرف کھلی رہتی تھیں۔ انھوں نے انسانی فکر کے ہر گوشے سے فیض اٹھایا۔

ابتدائے عمر میں انھیں یہ دنیا اور اس کے سارے مباحث و مظاہر دو رنگ کی دھاریوں میں بٹے ہوئے نظر آتے تھے — سیاہ و سفید حق و باطل (شیخ محمد اکرام نے اپنی قابل قدر تصنیف "موجِ کوثر" میں علی گڑھ اور ابوالکلام کے تعلق سے اسی پہلو پر، یا یوں کہیے کہ ابوالکلام کے ذہن کی اس یک طرفہ شدّت پر انگشت نمائی کی ہے۔) لیکن مسلسل مطالعے عملی مشاہدے اور قبولیت کے جذبے سے عہدِ حاضر کے مباحث پر غور و فکر کرنے اور تجربے کرنے کے ساتھ صداقت رنگا رنگ نظر آنے لگی۔ اب ان کے نزدیک کفر و اسلام کا مفہوم ہی بدل چکا تھا۔ عقائد پر اعمال کو اور رسوم پر انسانی فلاح و بہبود کے منشا کو، صداقت کی تلاش کو ترجیح دینے میں (جیسا کہ گاندھی جی کی سمادھی پر ان کی تقریر ۸۔۴ ۱۹۴ء سے روشن ہے) انھوں نے عملی مذاہب کے متعلق ایک کنجی تلاش کر لی تھی۔ اختلاف مذاہب محض رسمی ہے۔ جنّت و جہنم مقامات نہیں احوال ہیں، اور مذہب میں اصنام پرستی بھی خدا پرستی کی ضد نہیں — محض ظاہر کا پردہ ہے۔ کفر و ایمان کا رسمی تضاد بھی انھیں بے معنی نظر آنے لگا۔

یہ وہ مقام تھا جس کی راہ میں صدیوں سے اِنہی صوفیا کے قدموں کے نشان ثبت

تھے جنھیں امام غزالی نے مشکوک اور نقشبندیوں نے مردود قرار دیا تھا — انہی کا یہ قول مدارس و معابد میں عام تھا — الصوفی لامذھب لہٗ۔ سوامی شردھانند کے ایک جنونی قاتل عبدالرشید کے نام میں شہید جوڑنے والے تنگ نظر لوگ صوفی شہاب الدین کو مقتول ہی کہتے رہے۔

کمیونزم کو اسلام دشمن قرار دینے والوں کی صفوں میں مولانا کا شمار کسی وقت ہوا ہوگا اس کے بھی شواہد موجود ہیں۔ ۱۸-۱۶-۱۹ء کے دوران " الہلال "، (دورِ دوم) میں (مارکس و اینگلز) کے کمیونسٹ مینی فسٹو کا خلاصہ پہلی بار اردو میں چھپا۔ اور ہندستانی زبانوں میں دوسری بار۔ مولانا نے نہ صرف اسے گوارا کیا بلکہ اُن کے دائیں بائیں بازو پہ جو دو اہل قلم اور معتمد نیازمند تھے — دونوں کمیونسٹ خیال کے۔ قاضی عبدالغفار اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی — معمولی بات نہیں کہ کیرالا میں جب پہلی بار کمیونسٹ پارٹی نے الیکشن جیتا تو مولانا نے کھلے لفظوں میں وہاں کمیونسٹ وزارت بنانے کی تائید کی۔ یہ وہی حکومت تھی جسے (بعد میں کمیونسٹ تائید سے چلانے والی حکومت کی سربراہ) اندرا گاندھی نے پوری قوت لگا کر توڑ دیا تھا۔ (۱۹۵۹ء)

مولانا کا ذہنی سفر دو انتہاؤں کے درمیان مستقل ایک توازن، تناسب اور معقولیت کی جستجو اور اس کی تعمیل میں جاری رہا — ۱۹۰۵ء سے ۱۹۵۵ء تک جب انھوں نے تینوں مرکزی اکادمیوں کی داغ بیل ڈالی

ساہتیہ اکادمی
سنگیت، ناٹک اکادمی
للت کلا اکادمی

یہاں موسیقی، تصویر کشی، مورتی تراشنے ناچنے اور روپ بھرنے کے وہ سارے آرٹ مرکوز کیے گئے جو ملک بھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کا خاکہ تیار کرانے کے بعد وہ خود اپنی پسند سے چیرمین بنے اور ان کا ہدایت نامہ بھی اپنی مرضی سے مرتب کرایا۔ یہ فرض منصبی نہیں ان کا ذہنی فریضہ تھا۔ وسیع تر ذہنی افق کا تقاضا تھا۔

گاندھی جی اوّلین اور آخری شخص تھے جن سے مولانا کا بارہا سیاسی اختلاف ہوا اور ہر بار اس کا حل نکل آیا۔ مولانا ان کے کردار کی صداقت اور بے باکی کو بے مثل سمجھتے تھے، اسے مانتے تھے۔ ان کی شہادت پر فروری ۱۹۴۸ء میں مولانا نے کانسٹی ٹیوشن کلب کے جلسے میں جو تقریر کی — اس کا انجام یوں تھا۔

"۔۔۔۔ گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے۔ لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے اُن کو مٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے بلکہ سورج اور اس کی شعاعوں کی طرح سب کے لیے ہے۔۔"

عین یہی الفاظ مولانا کے ذہنی سفر کی منزلِ آخر پر بھی صادق آتے ہیں — اور اگر مہاتما گاندھی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو زندہ ہوتے تو صرف ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ غالباً یہی الفاظ مولانا کے لیے ادا کرنے میں حق بجانب ہوتے۔

ابوالکلام کی سیاسی بصیرت

مولانا ابوالکلام کو لفظ "بصیرت" (نکتہ رسی، دُور اندیشی اور گہری فکر و نظر کے معنی میں) بہت پسند تھا اور انھوں نے ایک بار سے زیادہ "میری بصیرت" اور "اپنی بصیرت" کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً:

"ایک سیکنڈ کے پچاسویں حصّے کے لیے بھی میری نسبت یہ توقّع نہ کرنا کہ میں نے جس حقیقت کو اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے..... اس حقیقت سے ایک انچ بھی ہٹ جاؤں گا" یا..... "کانگرس کی شرکت و عدم شرکت کی نسبت آپ نے عام خیالات کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ ٹھیک ہے..... لیکن 'میری بصیرت' اس معاملے کو بالکل دوسری ہی صورت میں دیکھتی ہے اور وہ آپ لوگوں کو ۱۹۱۲ء سے معلوم ہے....."

بصارت کی طرح بصیرت بھی (کسی نہ کسی حد تک، خُدا داد ہوتی ہے۔ اُس کا وہبی ہونا یقینی ہے، تاہم یہ یقینی نہیں کہ مختلف حالات، واقعات اُسے کہاں تک اُجھالتے اور اُبھارتے ہیں، یا دُھندلا اور بے مصرف بنا دیتے ہیں۔

بصیرت کی بنیادی ـــــ خداداد، وَہبی صلاحیت حالات و واقعات کے تصادم کی زد پر رہ کر ہی پروان چڑھتی ہے اور جس قدر وہ ان کا ہوشمندی اور قوّت کے

ساتھ سامنا کرے، خود کو اُن کا مدِ مقابل سمجھے، اُسی قدر وہ صیقل ہوتی جاتی ہے، اُس کی کاٹ بڑھتی جاتی ہے، بصیرت کی دُور رسی، فکر ونظر کی مُسلسل بیداری ایک طولانی عمل ہے، اکتسابی عمل ہے، مُتحرک عمل ہے ـــــ اور یقینی طور پر یہ وہ عمل ہے جو کامیابیوں سے زیادہ ناکامیوں میں پُختہ تر ہوتا ہے اور اپنے عامل کو آیندہ کے معاملات اور سبب و مُسبّب کے سلسلے سے آگاہی بخشتا ہے۔

آدھی بیسویں صدی پر پھیلی ہوئی ابوالکلام کی علمی اور عملی سرگرمی، ذہن اور زبان کی تیزی و دلاویزی ایک اور زندہ مثال ہے ہمارے سامنے اس حقیقت کی کہ اگرچہ قدرت نے انھیں نسلی وراثت کے طور پر غیر معمولی ذہنی قوّت اور جُرأتِ اظہار عطا کی تھی، لیکن سیاسی بصیرت کے فروغ میں، دانائے "رموزِ مملکت" ہونے میں، گتھیوں کو سُلجھانے کی بے مثال صلاحیت میں آیندہ کے اندیشوں کی پیش بندی میں دراصل قومی تحریکِ آزادی کے ان پچاس برسوں کا عمل دخل بہت ہے جن میں دریا کی موجِ تیز خرام کی طرح وہ برابر شریک رہے اور جن پچاس برسوں کے دوران ہندستان کی سرزمین پر ہر قسم اور ہر سمت اور ہر سطح کی آزادی کی لگن میں ایک ایسا پیچ در پیچ پے در پے آویزشوں اور آزمایشوں کا سلسلہ یکجا ہوا، جس کا تاریخِ عالم نے پہلے کبھی کسی ایک مقام پر، ایک قوم کے ساتھ تجربہ نہیں کیا تھا، اور اُسے آیندہ بھی شاید نہ دُہرایا جائے۔

اوّل بنگال، پھر مہاراشٹرا اور پنجاب میں پوری چھُپے موڈرن ہتھیاروں اور ہتھیار بندی انقلابی نوجوانوں کی سرگرمیاں فرداً فرداً دہشت پھیلانے اور بظاہر ناقابلِ شکست انگریزی راج کی اختیارت میں دراڑ ڈالنے کی سمجھی بوجھی پالیسی اور جاں بازی مذہبی رسوم کو، مظاہرے اور ہجوم کو نئی معنویت کی آنچ دینا (مثلاً گنپتی کا تیوہار) فقیروں اور سنیاسوں کی دربدر صداؤں میں سیاسی احتجاج کی چاشنی اور جوابی کارروائی کے اشارے راج کی مقرّرہ کونسلوں میں "آزادی کو اپنا پیدائشی حق" جتانے اور اس سے ایجی ٹیشن کی لہر پھیلانے کا کام + ہتھیار بند پلٹنوں کا نہتّا سامنا کرنے میں (ایک بے ہمّت) قوم کو حرکت میں لانے کی نیت علامتوں اور نشانیوں کے ذریعے (مثلاً ریشمی رومال) "حکومتِ وقت کا تختہ پلٹنے کی نیم خفیہ

تحریک + بے بسی کے احساس اور آزادی کی ترنگ میں وطن سے بے وطن ہونے اور بے سرو سامانی میں باہر نکل جانے کا جانبازہ ولولہ (ہجرت ۲۱-۱۸-۱۹ء) ٹیکس ادا نہ کرنے کا ایجی ٹیشن قدیم مذاہب کے عقیدوں کا احیا (REVIVAL) اور مذہبی احیا پرستی کے پرچم تلے ایسے تعلیمی اداروں کا قیام جو ایک طرف ماضی بعید پر فخر کرنا سکھائیں، دوسری طرف سیاسی اور معاشی آزادی کا جوش پیدا کریں (مثلاً آربندو گھوش اور آریہ سماج) ظلم اور جبر کے مقابل بے زبان صف بندی اور اخلاقی قوت کا اظہار (ستیہ گرہ) حاکم قوت کے حکم کی تعمیل سے صاف انکار (نان کوآپریشن) غاصبانہ اقتصادی حکمرانی کے توڑ پر بدیسی مال کا بائیکاٹ سرکار کے دست نگر انتظامی عدالتی اور تعلیمی اداروں سے قطع تعلق، گورنروں کے ماتحت کونسلوں میں شرکت، راج سے تعاون اور تعاون کے پردے میں نظام حکومت کو اندر سے توڑنے اور مستقبل میں اپنی حکومت چلانے کی قابلیت پیدا کرنے کی تدبیر + تشدد کے جواب میں عوامی غصے کے ایک اتفاقی اظہار (چوری چورا) پر اچانک پوری قومی تحریک کو ایک سیاسی سنت کے حکم سے روک دینے کی ہولناک حرکت + عالمی جنگ کے بگڑتے ہوئے حالات کا بے دست، بازو، خاموشی سے سامنا کرنے، بلکہ کسی بھی سامراجی دشمنی کی راہ کھلی چھوڑنے کا پرچار (انفرادی ستیہ گرہ) اور پھر قومی تحریک کے رہنماؤں کو چپ چاپ جیلوں میں جا بسنا اور قوم کو تشدد اور عدم تشدد (ہنسا، اہنسا) کے درمیان معلق چھوڑ جانا۔ ایک جانب حاکم وقت سے آزادی کی گفت وشنید، لین دین کی بات اور ساتھ ہی دوسری طرف جہازیوں، سپاہیوں، پولیس والوں اور نیم مسلح ملازمت پیشہ شہریوں کی شورش اور دلیرانہ قانون شکنی، جن کے سامنے کوئی مقامی حکومت بھی نہ ٹھہر سکتی + بالآخر حاکم و محکوم کے نمایندوں میں مول تول ہوتے ہوتے ناگہاں ملک کی تقسیم ——— جس میں آزادی کے پرچم کے تلے بہ یک وقت جشن بھی منایا گیا اور سوگ بھی + اور دو کروڑ سے زیادہ شہری آبادی کا گھر بار چھوڑ کر، جان کی سلامتی کی خاطر آزادی کی جانب وہ زبردست دیس نکالا (EXODUS) جو بے قصور اور غیر سیاسی ہجوم کے لہو میں شرابور تھا۔ اور بالآخر سیاسی آزادی

مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا۔ مگر میں ان سے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے۔ ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جاسکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملہ پر غور کرلیں، وہ اس کے سوا کوئی راہ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔"

مولانا کا یہ خطاب ان مسلمانوں سے تھا جو مسلم لیگ میں شامل ہوکر کانگریس کے خلاف اپنے اندیشے ظاہر کرتے رہتے تھے اور حکومت کے اشاروں پر مذہب کی دہائی دیتے تھے۔ مولانا نے بالکل صاف لفظوں میں کہا:

"میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اُس متحدہ

قومیت کا ایک ایسا عنصر ہوں۔ جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا
رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔
میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

اس طرح مولانا نے اعلان کیا کہ جہاں وہ ایک طرف مسلمان ہیں اور اسلام کی روایات اور ورثہ کے امین ہیں وہیں وہ ایک ہندستانی بھی ہیں اور پورے ہندستان پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ مولانا نے تاریخ کی روشنی میں بتایا کہ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔ وہ یہیں کے ماحول میں رچ بس گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انھوں نے کہا:

"یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔"

مسلمانوں کی ہندستان میں آمد نے یہاں کی تہذیب پر بھی اثر ڈالا اور تمدّن پر بھی۔ مسلمانوں نے اپنی وراثت ہندوؤں کے سپرد کر دی اور ان کی چیزیں خود اپنے لیے محفوظ کرلیں۔ اس طرح ایک نئی تہذیب کا ظہور ہوا۔ مولانا نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے۔ یہ زمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام دیا۔"

مولانا کے نزدیک ہندستان کے گوشہ گوشہ میں مسلمان آباد تھے اور ملک کے چپّہ چپّہ پر ان کا حق بالکل اسی طرح تھا جس طرح کہ دوسروں کا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے کہا:

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔"

اسلام اور ہندستان کے گہرے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے آگے کہا:

"ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت

ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر ہے کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید کی مذہب میں ضرورت ہے مگر یہ معاشرت میں ترقی سے انکار کرنا ہے۔"

مولانا کے نزدیک ہندستان کی اس ملی جلی تہذیب کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی دھرتی کے لال تھے دونوں کے دکھ اور برابر تھے۔ یہ تہذیب قدرت کی دین تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا:

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندستانی قوم، اور ناقابل تقسیم ہندستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی

قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

مولانا کی تقریر کے یہ حصّے کس قدر وزنی ہیں کہ آج تک ان کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ جس قدر مولانا کے عہد میں ضروری اور تازہ تھے اتنے ہی ضروری اور تازہ آج بھی ہیں۔ انھوں نے ان مسلمانوں کو سخت جواب دیا تھا جو حکومت کے اشارہ پر ہندستان میں مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ قوم سمجھتے تھے۔ جب کہ مولانا کا یہ کہنا بالکل صحیح تھا کہ ملک میں رہنے والے ہر فرقہ کے لوگ ایک گلدستہ کی طرح تھے جس میں طرح طرح کے پھول لگائے گئے تھے اور ہر پھول گلدستہ میں رہ کر ہی اپنی خوبصورتی قائم رکھ سکتا تھا۔ اس طرح مولانا کا خطبہ بڑا تاریخی تھا۔ مگر مسلم لیگ کو مولانا کا صدر بننا پسند نہ آیا اور نہ ہی ان کے صدارتی کلمات۔ اِدھر ۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو مولانا نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے متحدہ قومیت کی وکالت کی ہی تھی کہ اُدھر اس کے تیسرے ہی دن یعنی ۲۳ مارچ کو مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ایک اسلامی ملک کے قیام اور ہندستان کے بٹوارہ کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا کا مقابلہ ایک طرف تو برطانوی حکومت سے تھا تو دوسری طرف مسلم لیگ سے جو کسی طرح کانگریس کو مسلمانوں کی جماعت نہیں سمجھتی تھی۔ اس کا دعوا تھا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت تھی۔

برطانوی حکومت کے خلاف کانگریس کی جدوجہد مولانا کی رہنمائی میں پھر شروع ہو گئی۔ مولانا جنگ کے خلاف ہندستان میں ایک بڑی تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس بڑے پیمانہ پر تحریک چلانے میں تشدّد کا خطرہ تھا اس لیے مہاتما گاندھی کے مشورہ پر کانگریس نے ایک محدود ستیہ گرہ کی تحریک ۱۹۴۰ء میں شروع کر دی جسے انفرادی ستیہ گرہ کا نام دیا گیا اس تحریک کے تحت ایک ایک شخص جنگ کے خلاف تقریر کرتے ہوئے گرفتار ہوتا گیا۔ گرفتار ہونے والوں کی فہرست پہلے ہی بنا لی گئی تھی۔ اس کے مطابق سب سے پہلے ونوبا بھاوے نے گرفتاری کے لیے خود کو پیش کیا، اس کے بعد جواہر لال نہرو

گرفتار ہوئے اور پھر اسی طرح دوسروں کی باری آتی گئی۔ اگرچہ مولانا کا نمبر نہیں آیا تھا تاہم جب وہ پنجاب سے واپس ہو رہے تھے تو الہ آباد کے اسٹیشن پر انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا اور دو سال کے لیے نینی جیل بھیج دیا گیا جہاں سے وہ اپنی مدت سے پہلے ہی یعنی دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا کر دیے گئے۔

اس دوران میں جنگ نے ایک نیا موڑ لے لیا جرمنی ہر محاذ پر جیتنے لگا اور مغربی ملک اس سے شکست کھانے لگے۔ مسلسل کامیابی نے اس کے حوصلے اس قدر بلند کر دیے کہ اس نے جون ۱۹۴۱ء میں سوویت روس پر بھی حملہ کر دیا اور اسی سال دسمبر میں پرل ہاربر نامی امریکی بندرگاہ پر حملہ کر کے امریکہ کو بھی جنگ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح جنگ نے عالمی جنگ کی بھیانک شکل اختیار کر لی۔ ادھر جاپان کی فوجیں برطانیہ کے خلاف برما تک پہنچ گئیں اور انھوں نے انڈمان اور نکوبار پر قبضہ کر لیا۔ ایسی صورت میں امریکہ نے برطانوی حکومت پر زور ڈالا کہ وہ ہندستان کے رہنماؤں سے بات چیت کر کے انھیں جنگ میں تعاون کے لیے تیار کرے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان کے رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا ان میں مولانا بھی شامل تھے مگر اس بار رہائی پر مولانا کو کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ جنگ کے دو سال گزر جانے کے باوجود ہندستان کی آزادی کے حصول کے سلسلہ میں کانگریس کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسی دوران میں چین کے صدر چیانگ کائی شیک نے ہندستان کا دورہ کیا۔ ان کی بیگم میڈم چیانگ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے مولانا سے بھی ملاقات کی اور حکومت پر زور دیا کہ وہ ہندستان کی آزادی کو تسلیم کرے۔

اس دباؤ سے مجبور ہو کر حکومت نے اپنے ایک نمایندہ سر اسٹیفورڈ کرپس کو ۱۹۴۲ء کے آغاز میں ہندستان بھیجا تاکہ وہ یہاں کے رہنماؤں سے بات چیت کریں۔ سر کرپس پہلے بھی ہندستان آچکے تھے اور یہاں کے لیڈروں سے مل کر ان کے خیالات برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل کو بتا چکے تھے۔ اس لیے جب اس مرتبہ وہ دوبارہ ہندوستان آئے تو لوگوں نے ان سے بڑی امیدیں وابستہ کر لیں۔ کانگریس

کے صدر کی حیثیت سے مولانا نے سرکرپس سے بات چیت کی لیکن ان کی پیش کش مولانا کو قبول نہ تھی۔ اس میں جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ساری باتیں غیر واضح تھیں۔ اس لیے کانگریس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہندستان کو آزادی نہیں دے دی جاتی تب تک وہ جنگ میں مدد کرنے سے معذور رہے۔

آخری قید

کرپس مشن کے ناکام ہوجانے کے بعد گاندھی جی نے مولانا سے "ہندستان چھوڑو" تحریک چلانے کے سلسلہ میں گفتگو کی مگر مولانا کو یقین تھا کہ جنگ میں برطانیہ بری طرح الجھ چکا ہے اس لیے وہ کسی صورت میں ہندستان کے لوگوں کو کوئی بڑی تحریک چلانے نہیں دے گا اور لیڈر گرفتار کر لیے جائیں گے۔ لیڈروں کے جیل چلے جانے پر عوام قیادت اور رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے ایسی صورت میں وہ تشدد کا سہارا بھی لے سکتے تھے جس سے تحریک کا مقصد پورا نہیں ہونا مگر مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ حکومت تحریک چلانے والوں کو گرفتار نہیں کرے گی۔

۸ راگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگریس کا تاریخی اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں مہاتما گاندھی نے "کرو یا مرو" کا نعرہ دیتے ہوئے اپنی تاریخی قرار داد "ہندستان چھوڑو" پیش کی اس میں انگریزی حکومت سے کہا گیا تھا کہ وہ اقتدار ہندستانیوں کے حوالہ کر دے اور انگریزوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ہندستان چھوڑ کر چلے جائیں اور ہندستان کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر "ہندستان چھوڑو" سے متعلق قرار داد بڑی اکثریت سے منظور ہوگئی۔ اجلاس میں شرکت کے بعد جب مولانا اپنے میزبان بھولا بھائی دیسائی کے مکان پر پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ ان کی گرفتاری کی افواہ گرم ہے۔ مولانا بغیر کسی پریشانی کے بستر پر لیٹ گئے۔ صبح جب انھیں جگایا گیا تو پولیس کا ڈپٹی کمشنر ان کی گرفتاری

کا وارنٹ لیے دروازہ پر حاضر تھا۔ مولانا نے بڑے اطمینان سے چائے پی، کچھ خط لکھے اور صبح پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر پولیس کی کار میں جا بیٹھے انھیں بمبئی کے وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن لے جایا گیا کانگریس کے دوسرے لیڈر بھی وہاں آپہنچے تھے جن میں جواہرلال نہرو، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود بھی شامل تھے پلیٹ فارم بالکل سونا پڑا تھا اگرچہ اس وقت وہاں ہزاروں انسانوں کو آجانا چاہیے تھا لیکن پولیس نے احتیاط سے سب کو پلیٹ فارم سے دور رکھ کر وہاں ہجوم کو اکٹھا ہونے سے روک دیا تھا۔ تمام کانگریسی رہنماؤں کو ایک ٹرین میں بٹھا دیا گیا تب انھیں معلوم ہوا کہ مہاتما گاندھی بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔

پہلے افواہ تھی کہ ان سب کو جنوبی افریقہ لے جایا جائے گا مگر جب ٹرین پونا کے اسٹیشن پر پہنچی تو مہاتما گاندھی کو اتار لیا گیا اور دوسرے لیڈروں کو احمد نگر لے جاکر وہاں کے مشہور قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ یہ مولانا کی چھٹی گرفتاری تھی جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا تھا لیکن اس مرتبہ قید کی میعاد معلوم نہ تھی کیونکہ حکومت نے نہ تو ان پر مقدمہ چلایا اور نہ ہی ان کے خلاف کسی قسم کا الزام قائم کیا اس طرح یہ قید دوسری گرفتاریوں سے مختلف تھی جس میں ملزم تو تھا مگر نہ عدالت تھی اور نہ سزا کی میعاد۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اب ان کی نگرانی کے لیے فوجی افسر مقرر تھے۔

مولانا کے جیل کے ساتھیوں میں جواہرلال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، آچاریہ کرپلانی، بیرسٹر آصف علی، گووند بلبھ پنت، شنکر راؤ دیو، پٹا بھی سیتا رمیہ، پرمل چندر گھوش، آچاریہ نریندر دیو اور ڈاکٹر سید محمود شامل تھے۔ قلعہ کے اندر ایک احاطہ تھا جو دوسو فیٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فیٹ چوڑا تھا۔ اس کے تینوں طرف کئی کمرے تھے جو بارک بن گئے تھے قطار کا پہلا کمرہ مولانا کے حصہ میں آیا۔ کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی مولانا چارپائی پر دراز ہوگئے کیونکہ بمبئی کی مصروفیت اور سفر کی تکان نے بے حال کر دیا تھا۔ خود مولانا کے الفاظ میں "نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری . . . . تقریبًا تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔" یہی حال تقریبًا سبھی رہنماؤں

کار ہا پھر یہ تمام لوگ دن میں چار مرتبہ ایک جگہ اکٹھا ہونے لگے، صبح آٹھ بجے ناشتے کے لیے، گیارہ بجے دن کو دوپہر کے کھانے کے لیے، چار بجے شام چائے کے لیے اور آٹھ بجے رات میں کھانے کے لیے۔

دن کا کھانا کھا کر سبھی ساتھی مولانا کے کمرہ میں جمع ہو جاتے جہاں مختلف مسائل پر ان کی بات چیت ہوتی، شام کی چائے کے بعد ورزش کی جاتی اور رات کے کھانے کے بعد دس بجے تک ڈائننگ روم میں جمع ہو کر تمام لیڈر مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ کرتے۔ اس طرح حکومت نے ان تمام "خطرناک قیدیوں" کو احمد نگر کے قلعہ میں مقیّد کر کے باہر کی دنیا سے ان کے تعلق کو ختم کر دیا۔ مولانا نے بمبئی کے اسٹیشن پر چند لمحوں کے لیے ٹرین میں مہاتما گاندھی سے ملاقات کی تھی اور انھیں بہت زیادہ مایوس پایا تھا۔ اگرچہ مولانا نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ جنگ کے دوران میں حکومت کسی بھی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی اور سبھی رہنماؤں کو گرفتار کر کے عوام کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گی مگر مہاتما جی کا خیال تھا کہ حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ اس طرح مولانا کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ قلعہ میں شروع شروع میں نہ تو اخبارات دیے گئے اور نہ ہی انھیں خط و کتابت کی اجازت دی گئی۔ مولانا نے حکومت کے اس رویّہ پر احتجاج کیا اور وائسرائے کو خط میں لکھا کہ جیل میں سزا یافتہ مجرموں تک کو خط لکھنے کی اجازت تھی جب کہ ان سیاسی قیدیوں کے لیے اس کی بھی ممانعت تھی لیکن اگر دو ہفتہ انتظار کرنے کے بعد بھی حکومت سے کوئی جواب نہیں ملا تو مجبور ہو کر وہ جو بھی مناسب سمجھیں گے قدم اٹھائیں گے۔ پندرھویں ہی روز ان سب لیڈروں کو ہفتہ میں ایک بار عزیزوں سے خط و کتابت کی اجازت مل گئی اور انھیں اخبارات بھی دیے جانے لگے۔

احمد نگر کے قلعہ میں مولانا کو خاصی فرصت تھی، شروع شروع میں تو

انھیں اس فرصت سے الجھن ہونے لگی مگر پھر انھوں نے خود کو اس کا عادی بنا لیا۔ اور اپنے آپ کے لیے کچھ معمول مقرر کر لیے اور ان پر سختی سے عمل کرنے لگے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ :

"چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی آخری قطار کے آخری کمرے میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لیے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی ہے اور تمام ساتھیوں کو بھی اسی کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔"

مولانا کی پابندی نے سبھی ساتھیوں کو پابند ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنی بہن کرشنا ہتھی سنگھ کے نام ایک خط میں جواہر لال نہرو نے لکھا تھا کہ :

"یہاں ہم سب بڑے نظم و ضبط کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مولانا ہیبت ناک حد تک وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم کو ہر لحظہ چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ کسی وقت چند سکنڈ کی بھی دیر نہ ہو جائے۔"

مولانا کی صبح رات کے آخری پہر سے شروع ہو جاتی تھی۔ ان کا پہلا معمول چائے نوشی تھا۔ دراصل چائے نوشی کا ذوق ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گیا تھا۔ انھوں نے اس کی تعریف میں نثری قصیدے لکھے اور اس سے پورا پورا لطف اٹھایا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی ... چائے پی رہا ہوں ... بہت لطیف ہے ..."

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

"اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگ کی نسبت کیا کہوں، لوگوں نے آتش سیال کی ترکیب سے کام لیا ہے... میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا

ہوں کر یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلوریں فنجان میں
گھول دی ہیں۔"

مولانا بڑی نفاست سے چائے نوشی کرتے تھے۔ وہ چائے میں دودھ استعمال کرنے کے سخت مخالف تھے اور دودھ اور دہی کی دنیا کو چائے کی دنیا سے بالکل الگ سمجھتے تھے۔ مولانا "وہائٹ جیسمین" نام کی چائے کے شوقین تھے۔ جب احمد نگر میں ان کا یہ مخصوص برانڈ ختم ہوگیا تو حکومت نے ہر جگہ کوشش کی کہ کسی طرح یہ چائے کہیں سے مل جائے تب بڑی مشکل سے بمبئی کے فوجی اسٹور سے مل سکی۔ ویسے جواہر لال نہرو نے بھی اپنی بہن کو بمبئی خط لکھ کر مولانا کے لیے کچھ ڈبے منگوا دیے تھے اس لیے مولانا بڑے مطمئن تھے۔

مولانا کے معمولات میں پڑھنا اور لکھنا بھی اہمیت کا حامل تھا۔ دراصل مولانا نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنے رفیقِ خاص نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن رئیس بھیکم پور کے نام خطوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جنھیں کبھی ڈاک کے سپرد نہ کیا گیا۔ البتہ مولانا کی رہائی کے بعد ان تمام خطوط کو "غبار خاطر" کے نام سے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا گیا جو اردو ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قلعہ کے خالی احاطہ کو چمن میں بدلنے کا فیصلہ کر کے باغبانی کے کام میں بھی دلچسپی لی۔ پونا سے خاص طور سے بیج منگوائے اور تیس چالیس قسم کے بیج بو کر اُن کو سینچا تو یہ بیج پھوٹ نکلے اور انھوں نے پودوں کی شکل اختیار کر لی۔ اور جب ان میں سے پھول کھلنے لگے تو سارا احاطہ سرسبز و شاداب ہو کر بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکنے لگا۔ اپنے ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں:

"جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام

چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرّت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔"

اس طرح قید میں رہنے کے باوجود مولانا نے قید خانے کو بھی اپنے لیے خوشیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ مولانا اپنی بنائی ہوئی دنیا میں مگن تھے کہ انھیں ۱۵ر فروری ۱۹۴۳ء کو اپنی بیگم زلیخا کی بیماری کا خط ملا۔ مولانا بے چین ہو اٹھے۔ ان کی ہمالیائی شخصیت ہل گئی۔ مولانا نے فوراً ہی تار کے ذریعہ ان کی طبیعت معلوم کی تو پتا چلا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ۲۲ر مارچ کو مولانا کو پہلی بار اپنی بیگم کی خطرناک بیماری کی اطلاع ملی جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو تار کے ذریعہ دی گئی تھی۔ مولانا کی ڈاک پہلے دلّی جاتی تھی اور وہاں سے منظوری ملنے کے بعد ان کو بھیجی جاتی تھی اس لیے یہ اطلاع بھی اسی منزل سے ہو کر گزری اور بڑی دیر بعد مولانا کو ملی۔ سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے کہا کہ اگر وہ اس تار کے سلسلہ میں حکومت سے خط و کتابت کرنا چاہیں تو وہ فوراً ان کے خط کو بمبئی بھیج دے گا۔ مگر مولانا نے "اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔" جواہر لال نہرو نے بھی انھیں سمجھایا کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت سے بات چیت کریں مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا۔

مولانا کی شادی تیرہ سال کی عمر میں زلیخا بیگم کے ساتھ ہوئی تھی جو مولانا کے والد کے مرید آفتاب الدین کی پانچویں بیٹی تھیں۔ آفتاب الدین کلکتہ کے سروے آفس میں ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ وہ بغداد کے ایک شریف خاندان کے فرد تھے۔ زلیخا کا نام بھی مولانا کے والد مولانا خیر الدین ہی نے تجویز کیا تھا۔ زلیخا بیگم اردو، فارسی میں مہارت رکھتی تھیں اور عربی سے واقف تھیں۔ انھوں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا جس کا نام حسین تھا مگر وہ چار سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ زلیخا بیگم بڑی سلیقہ مند خاتون تھیں وہ مشرقی روایت کی امین تھیں۔ گھریلو کام کاج میں یکتا تھیں۔ نفاست پسند تھیں اور مہمان نواز بھی۔ مولانا پر جان نثار کرتی تھیں۔ ان کے آرام کا خیال رکھتیں، ان کے ساتھ رات رات بھر جاگ کر ان پر پنکھا جھلتی رہتیں۔ جب لوگ کہتے کہ اتنی محنت کیوں کرتی ہو تو کہتیں،

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں" مولانا کی مالی حالت کبھی اچھی نہ رہی مگر زلیخا بیگم نے قناعت پسندی کا ثبوت دیا اور کبھی کسی شکایت کو ہونٹوں تک نہ آنے دیا۔ وہ ہر حال میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہتیں۔ مولانا گھر پر ہوتے تو ان کی خدمت کرتیں اور اگر سفر میں ہوتے یا جیل میں مقید ہوتے تو ان کی سلامتی کے لیے دُعائیں کرتیں۔ اگرچہ انھیں نہ اچھا کھانے کا شوق تھا نہ ہی اچھا پہننے کا لیکن اپنے شوہر کو وہ ہمیشہ اچھا کھلاتیں اور اچھا پہناتیں۔ غرض کہ وہ ہر قدم پر ان کا ساتھ دیتیں۔ جب فروری ۲۲ء میں مولانا کو سزا کا حکم سنایا گیا تو زلیخا بیگم نے ایک طویل تار مہاتما گاندھی کو دیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ:

"میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کر رہی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی (مولانا) خدمات سے خالی ہوئی ہے ان کے لیے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو اُن کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔ میرے لیے یہ ایک بڑا بوجھ ہے لیکن میں خدا سے مدد کی پوری امید رکھتی ہوں"

اس طرح سیاسی کاموں میں بھی وہ مولانا کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ وہ ہر وقت ان کے لیے فکرمند رہتیں اِنھیں فکروں نے انھیں دق کا مریض بنا دیا تھا۔ جب مولانا نینی جیل میں تھے تو وہ بیمار پڑ گئی تھیں مگر انھوں نے مولانا کو اس کی اطلاع نہیں دینے دی کہ مبادا وہ فکرمند اور پریشان ہو جائیں۔ رہائی کے بعد مولانا کو صورتِ حال کا علم ہوا تو انھوں نے زلیخا بیگم کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے رانچی بھیج دیا اس سے انھیں کافی فائدہ پہنچا۔ اس پورے عرصہ میں مولانا سفر میں رہے اور جولائی کی آخری تاریخوں میں کلکتہ واپس ہوئے تو چار روز قیام کرنے کے بعد ۳ راگست کو پھر بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا

تو ۲۰ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے 'خدا حافظ' کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا . . . گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ . . . شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

مولانا نے اگرچہ رہائی کے سلسلہ میں حکومت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا مگر اُن کے دل کا سکون جاتا رہا تھا۔ مولانا خود لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ، بناوٹ اور نمایش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن نہیں بننے دیتے۔"

تاہم مولانا نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ اُدھر زلیخا بیگم کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی ان کے طبیبوں نے حکومت کو لکھا کہ بیگم زلیخا کی گرتی ہوئی حالت ان کی زندگی کی مدت کو کم کر رہی ہے ایسی صورت میں مولانا کو اپنی بیگم سے ملنے کی اجازت دے دی جائے لیکن حکومت نے معالجوں کے اس اہم خط کو بھی نظر انداز کر دیا آخر ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو مولانا کی آٹھ مہینے اور ایک

ہفتہ کی عدم موجودگی کے دوران میں اپنے شوہر کو ایک نظر دیکھ لینے کی حسرت لیے زلیخا بیگم ہمیشہ کے لیے اس مادّی دنیا سے مُنہ موڑ گئیں۔ اس سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"اس طرح ہماری چھتّیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے ۔ ۔ ۔ مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں۔"

اس طرح مولانا کی رفاقت نے دم توڑ دیا اور وہ اس بھری پُری دنیا میں بالکل اکیلے رہ گئے۔ اس کے کچھ ہی روز بعد ان کی بہن آبرو بیگم بھی مختصر سی بیماری کے بعد بھوپال میں وفات پاگئیں۔ ایک کے بعد ایک صدمہ نے مولانا کو نڈھال کردیا مگر انھوں نے کبھی اپنی روح کو پژمردہ نہیں ہونے دیا۔ اُدھر مہاتما گاندھی، جنھیں اگست ۴۲ء میں پونا کے آغا خاں پیلیس میں رکھا گیا تھا، اپنی رفیقۂ حیات کستوربا گاندھی کو ایک مختصر سی بیماری کے بعد گنوا بیٹھے۔ اسی جیل میں ان کے ساتھی اور سکریٹری مہادیو دیسائی نے بھی انتقال کیا۔ انھیں دنوں مہاتما گاندھی نے اکیس دن کا برت رکھ لیا تاکہ ان کے نفس کا تزکیہ ہوسکے۔ دراصل رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد عوام تشدّد پر اتر آئے تھے۔ انھوں نے اپنی مرضی سے سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی، افسروں پر حملے کردیے، ٹرین کی لائنیں اکھاڑ دیں، بجلی اور فون کے کھمبے اکھاڑ پھینکے۔ مولانا آزاد اس سلسلہ میں پہلے ہی اپنے اندیشے کا اظہار کرچکے تھے۔ حکومت نے اس کی ذمہ داری مہاتما جی کے سر رکھ دی۔ اس لیے انھوں نے اکیس روز کا برت رکھ لیا۔ اس دوران میں ان کی حالت نازک ہوگئی تاہم انھوں نے برت کامیابی کے ساتھ پورا کرلیا۔ حکومت اب کسی قسم کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی اس لیے اس نے مہاتما جی کو رہا کردیا۔

رہائی

اسی اثنا میں کانگریسی رہنماؤں کو اُن کی صوبائی جیلوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ ہوگیا۔ اس کے تحت اپریل ۴۵ء میں مولانا آزاد کو احمد نگر سے بنگال کی بانکوراجیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ان کی صحت گر چکی تھی اور وزن چالیس پونڈ گھٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں حکومت نے اعلان کیا کہ شملہ میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے جس میں حکومت ہندستان کی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے بات چیت کرے گی تاکہ آزادی کے مسئلہ کا کوئی حل نکل سکے۔ نتیجہ میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی ۱۵ جون کو بانکوراجیل سے رہا کر دیا گیا۔ جب وہ کلکتہ پہنچے تو ہوڑہ کے اسٹیشن پر ایک بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ انھیں جلوس کی شکل میں لے جایا گیا اور پھولوں سے لاد دیا گیا۔ مولانا نے اپنی کار کا رخ قبرستان کی طرف کروا دیا اور اپنی بیوی زلیخا بیگم کی قبر پر نمناک آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اور ایک پھولوں کا ہار اپنی کار سے اٹھا کر اُن کی قبر پر ڈال کر اپنا نذرانہ پیش کیا۔ اتنے بڑے ہجوم کے باوجود مولانا اب اکیلے تھے، بالکل اکیلے۔

کانگریس نے مولانا آزاد کو اپنے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شملہ کانفرنس میں شرکت کا اختیار دیا۔ کانفرنس میں قریب قریب وہی تجویزیں رکھی گئیں جو ۴۲ء میں سر کرپس پیش کر چکے تھے لیکن اب جب کہ جنگ ختم ہونے والی تھی مولانا ان کو قبول کرنے ہی میں ہندستان کا مفاد سمجھتے تھے۔ ان تجاویز کے تحت وائسرائے کی کونسل کے تمام ممبروں کو ہندستانی ہونا تھا مگر مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے اصرار کیا کہ کانگریس کو کسی مسلمان کو اس کا رُکن نامزد کرنے کا

کوئی حق نہیں کیونکہ مسلمانوں کو نامزد کرنے کا اختیار صرف مسلم لیگ کو حاصل تھا۔ جناح کی یہ ضد بالکل غلط تھی۔ کانگریس کی صدارت کا بار پچھلے چھے سال سے مولانا آزاد کے کاندھوں پر تھا اور وہ ایک مسلمان تھے، ایسی صورت میں مسلم لیگ کا مسلمانوں کی نمایندگی کا دعوا قطعی غیر مناسب تھا اور ناجائز بھی۔ مولانا نے صاف صاف کہا کہ کانگریس لیگ کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کر سکتی کیونکہ سیاسی معاملات میں ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ کسی طرح کانگریس کو ایک ہندو جماعت سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے جب کہ وہ خود اس کے صدر تھے۔ اسی مسئلہ پر کانفرنس ناکام ہوگئی مگر کانگریس نے اپنا سیکولر کردار دنیا پر واضح کر دیا۔ مولانا کو آرام کی سخت ضرورت تھی اس لیے وہ کانفرنس کے بعد کشمیر چلے گئے۔

جنگ کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ اس کی ہولناک پرچھائیوں نے ساری دنیا کے لوگوں کے مستقبل کو تاریک بنا دیا تھا ایسے حالات میں انگلینڈ میں عام انتخابات ہوئے اور ان میں لیبر پارٹی کو فتح حاصل ہوئی۔ لیبر پارٹی نے ہمیشہ ہندستان کے رہنماؤں کے ساتھ ہمدردی کی تھی اس لیے مولانا نے اس سے بڑی امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ اس کے بعد ہی وائسرائے لارڈ ویول نے ہندستان میں بھی الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا مولانا کے اصرار پر کانگریس نے انتخابات میں حصہ لینا منظور کرلیا۔ نتیجہ میں تین صوبوں کے علاوہ تمام صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کو تقریباً آدھی نشستیں ملیں، اور وہ وہاں سب سے بڑی پارٹی ثابت ہوئی۔ پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کو برابر نشستیں ملیں۔ سندھ میں اگرچہ مسلم لیگ کو سب سے زیادہ نشستیں ملیں تاہم وہ اکثریت سے محروم رہی یہ تینوں صوبے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے تھے اور الیکشن میں لیگ نے وہاں کے ووٹروں کے جذبات کو مذہب کے نام پر ابھارا تھا تاہم صوبہ سرحد مسلم اکثریتی صوبہ ہونے کے باوجود مسلم لیگ کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔ وہاں کانگریس کو اکثریت ملی اور اسی نے حکومت بنائی۔

الیکشن کے بعد مولانا کا بیشتر وقت صوبوں میں حکومت سازی کے سلسلہ میں گزرا۔ انھوں نے بہار میں کانگریس کے گروہوں کے درمیان اختلافات ختم کرائے اور متفقہ طور پر کانگریسی وزارت بنوائی۔ پنجاب میں کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان مصالحت کرا کے دونوں کی ملی جلی حکومت بنوائی۔ کانگریس پنجاب میں پہلی بار حکومت میں شامل ہوئی تھی۔ اسی زمانہ میں بحری فوج کے افسروں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ مولانا نے خوبصورتی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرایا اور افسروں کو واپس اپنے کام پر جانے کے لیے راضی کر لیا۔ اسی طرح برطانوی حکومت آزاد ہند فوج کے افسروں اور سپاہیوں پر مقدمہ چلا رہی تھی۔ آزاد ہند فوج برما میں سبھاش چندر بوس نے ترتیب دی تھی جس نے بڑی بہادری کے ساتھ ہندستان کی آزادی کے لیے برطانیہ کے خلاف جنگ کی تھی جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تو آزاد ہند فوج کے سپاہیوں اور افسروں کو بھی گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا نے حکومت سے کہا کہ وہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے۔ مولانا نے ملزموں کی پیروی کا انتظام کیا اس کے نتیجہ میں جواہر لال نہرو، ڈاکٹر کاٹجو، تیج بہادر سپرو، آصف علی اور بھولا بھائی دیسائی نے ان کی پیروی کی۔ انجام کار تمام ملزم رہا کر دیے گئے۔

لیبر پارٹی کے اقتدار میں آتے ہی وزیراعظم ایٹلی نے ہندستان کی آزادی کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے ایک وزارتی مشن دلی بھیجا اس کے تین رُکن تھے۔ لارڈ پیتھک لارنس جو وزیر ہند تھے، سر کرپس جو بورڈ آف ٹریڈ کے پریزیڈینٹ تھے اور اے۔ وی۔ الگزینڈر جو فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی تھے۔ یہ تینوں برطانوی کابینہ کے ممبر تھے اسی لیے اسے کابینہ مشن، کہا جاتا ہے۔ یہ مشن ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو دلی پہنچا۔ ۶ اپریل کو مولانا نے مشن کے ممبروں سے ملاقات کی تو انھوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں مولانا کی تجویز معلوم کرنی چاہی۔ مولانا کے نزدیک ہندستان اور برطانیہ کے درمیان کوئی سیاسی معاملہ حائل نہ تھا کیونکہ برطانیہ تو

ہندستان کو آزادی دینے کے لیے تیار ہو چکا تھا اب مسئلہ محض فرقہ واریت کا تھا جس کے تحت مسلم لیگ نے بہت سے اندیشوں کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے جب کابینہ مشن نے اس سلسلہ میں ان کے خیالات معلوم کیے تو مولانا نے کہا کہ ہندستان کے آئین کو وفاقی ہونا چاہیے جس کی رو سے دفاع، خارجی معاملات اور رسل و رسائل کے محکموں کو مرکزی حکومت کی تحویل میں ہونا چاہیے اور ان تین کے علاوہ سارے اختیارات صوبائی حکومتوں کو حاصل ہونے چاہییں البتہ اگر صوبے اپنے فائدے اور مرضی کے تحت بعد ازاں کچھ اور اختیارات مرکزی حکومت کو سونپنا چاہیں تو وہ ان پر منحصر ہوگا۔ کابینہ مشن کے ممبروں نے مولانا کی تجویز سنی تو وزیر ہند نے اسے مسئلہ کا ایک نیا حل بتایا۔ یہی تجویز مولانا نے کانگریس کے سامنے پیش کی تو وہ بھی مطمئن ہوگئی اور اس نے اسے منظور کر لیا۔ کابینہ مشن نے ایک نئی تجویز کا اضافہ کرتے ہوئے مولانا کے فارمولے پر مشتمل اپنا منصوبہ پیش کر دیا۔ اس نے جس نئی تجویز کا اضافہ کیا تھا اس کے تحت ملک کے تمام صوبوں کو اے۔بی۔سی کے تین گروپوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مشن نے فوری طور پر ایک گورنر جنرل کی کونسل کی تشکیل کی تجویز بھی رکھی جس کے تمام ممبروں کو ہندستانی ہونا تھا۔

مولانا نے کانگریس سے کابینہ مشن کے منصوبہ کو منظور کرا لیا کیونکہ اس سے ہندستان کی وحدت قائم رہتی تھی اور آزادی نظروں کے سامنے تھی اگرچہ مشن نے پاکستان کے مطالبہ کو رد کر دیا تھا تاہم لیگ نے بھی اسے منظور کر لیا مولانا کی صدارت اور سربراہی میں یہ آخری کارنامہ تھا جو انھوں نے وطن عزیز کی خاطر انجام دیا کہ مشن کے منصوبہ کو کانگریس سے منوا لیا کیونکہ ۷ رجولائی ۴۶ء کو بمبئی میں جب کانگریس کا اجلاس ہوا تو مولانا نے اپنے جانشین اور نئے صدر کانگریس کی حیثیت سے جواہر لال نہرو کا نام پیش کیا۔ اس طرح سات سال کی طویل مدت اور انتہائی نازک حالات میں ملکی سیاست کی کشتی کو کنارے پر لگانے کے بعد مولانا کانگریس کی صدارت کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اس اجلاس میں

کانگریس کی طرف سے سردار پٹیل نے مولانا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے تئیں خراج تحسین پیش کیا۔ کانگریس کی پوری تاریخ میں مولانا کے علاوہ یہ اعزاز کسی کو نصیب نہیں ہوا کہ وہ سات برس تک مسلسل کانگریس کا صدر رہا ہو۔ ان کی رہنمائی دانش مندی اور تدبر کا مجموعہ تھی جس نے ملک کو آزادی کی دہلیز پر لا کھڑا کیا تھا۔

بعد ازاں مشن کے منصوبہ سے متعلق وضاحت کرتے ہوئے ایک پریس کانفرنس میں جواہر لال کے ایک بیان سے لیگ بدظن ہو گئی اور غلط فہمی اس حد تک بڑھی کہ اس نے منصوبہ کو نامنظور کر دیا اور مولانا کی انتھک کوششوں سے جو خوشگوار فضا ملک میں قائم ہوئی تھی وہ پھر مکدر ہو گئی۔ کانگریس نے وضاحتیں پیش کیں، یقین دلایا مگر لیگ نے منصوبہ کو نامنظور کر کے پاکستان حاصل کرنے کے لیے راست اقدام کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں ہندستان کے گوشہ گوشہ میں فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو گیا اور ہندو مسلم فسادات اور تشدد کا بازار گرم ہو گیا۔ بنگال میں حسین شہید سہروردی کی حکومت تھی۔ انھوں نے ۱۶ر اگست ۴۶ء کو راست اقدام کے روز سرکاری تعطیل کا اعلان کر دیا پھر کیا تھا۔ بنگال میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور نواکھالی میں فسادات نے وہ قیامت برپا کی کہ انسانیت شرمانے لگی۔

کانگریس نے مولانا آزاد، سردار پٹیل اور راجندر پرساد پر مشتمل ایک پارلیمانی سب کمیٹی نامزد کی تھی اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ عبوری حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں وائسرائے کو اپنی تجویز پیش کرے۔ کانگریس نے بڑی کوشش کی کہ لیگ بھی عبوری حکومت میں شامل ہو جائے لیکن وہ تیار نہ ہوئی اور علاحدہ رہ کر پاکستان کے مطالبہ کو تقویت پہنچاتی رہی۔ پہلی ستمبر کو جواہر لال کی قیادت میں ہندستان میں عبوری حکومت قائم ہوئی جس میں سبھی فرقوں کو نمایندگی دی گئی تھی۔ اس حکومت میں کانگریسی رہنماؤں نے مولانا سے اصرار

کیا کہ وہ بھی عبوری حکومت میں شامل ہوجائیں لیکن مولانا کا خیال تھا کہ وہ حکومت سے باہر رہ کر زیادہ کام کرسکیں گے اس لیے انھوں نے اپنی جگہ آصف علی کا نام پیش کردیا۔ کانگریس کے اس طرح اقتدار میں آجانے سے لیگ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اکتوبر میں حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئی۔ لیگ کے ممبروں کو جگہ دینے کی غرض سے سرت چندر بوس، سرشفاعت احمد خاں اور سیّد علی ظہیر کو عبوری حکومت سے مستعفی ہونا پڑا۔ مولانا کے منع کیے جانے کے باوجود لیگ کو مالیات کا محکمہ دیا گیا جس کی سربراہی لیاقت علی خاں کے ذمہ تھی۔ دراصل وہ امور داخلہ کی وزارت چاہتے تھے مگر سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے اور اسے اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے اس لیے مالیات کا محکمہ لیگ کے حوالے کرنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریسی وزیروں کو چپراسی تک کے تقرر کے لیے وزیر مالیات کا مُنہ تکنا پڑتا تھا۔

۹ر دسمبر ۴۶ء کو آزاد ہندستان کا آئین مرتّب کرنے کے لیے دِلّی میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ اس کی صدارت کے لیے مولانا کا نام بھی تجویز ہوا مگر وہ تیّار نہیں ہوئے۔ سردار پٹیل اور جواہر لال اس منصب پر کسی ایسی باوقار شخصیت کو فائز کرنے کے حق میں تھے جو حکومت سے باہر ہو، اور ایسی شخصیت مولانا ہی کی تھی۔ بالآخر اسمبلی کی صدارت کے لیے ڈاکٹر راجندر پرساد کا نام تجویز ہوا اور انھوں نے بڑے وقار کے ساتھ اس عظیم ادارے کی سربراہی کے فرائض انجام دیے۔ اسمبلی بڑے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ آئین سازی کے کام میں مصروف ہوگئی مگر لیگ کے ممبروں نے اس میں شمولیت اختیار نہیں کی۔

آزادی

اگرچہ مولانا نے ستمبر میں عبوری حکومت میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا تاہم وہ بہت دن باہر نہیں رہ سکے اور بالآخر مہاتما گاندھی اور دوسرے ساتھیوں کے اصرار پر ۱۵ر جنوری ۴۷ء کو تعلیم کے ممبر کی حیثیت سے عبوری حکومت کا اہم ستون بن گئے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال کے نزدیک آزاد ہندستان میں تعلیم کا محکمہ بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ برطانوی عہد حکومت میں تعلیم کا مقصد ہندستانیوں کو انگریزوں کا وفادار بنانا تھا اسی لیے تحریک آزادی کے دوران میں قومی رہنماؤں نے ہمیشہ تعلیم کے میدان میں اصلاحات اور قومی تعلیم پر زور دیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی قومی تعلیمی ادارے اسی لیے قائم ہوئے تھے کہ وہ قومی تعلیم کو فروغ دے سکیں۔ اسی سبب سے جب آزادی کی منزل نظر آنے لگی تو قومی رہنماؤں نے نظام تعلیم کی از سر نو تشکیل کا منصوبہ بنایا اور اسے مولانا آزاد کے سپرد کر دیا۔ اب تک عبوری حکومت میں تعلیم کا محکمہ راج گوپال آچاریہ کے ذمہ تھا۔

۲۰ر فروری کو وزیر اعظم ایٹلی نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت جون ۴۸ء تک ہندستان کی حکمرانی سے دست بردار ہو جائے گی اور لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا ہے۔ مولانا لارڈ ویول کے

مزاج تھے ۔ انھیں ویول کی نیک نیتی اور صدق دلی پر یقین تھا ۔ انھوں نے ویول کو بڑے اچھے لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا ۔ ۲۲ مارچ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن دلی پہنچے اور دو روز بعد یعنی ۲۴ مارچ کو انھوں نے نئے وائسرائے کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف لیا ۔ پھر انھوں نے ہندستانی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان کو یقین دلایا کہ وہ ہندستان کی آزادی کے مسئلہ کو حل کرنے ہی کے لیے ہندستان آئے تھے ۔

ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے ۔ فرقہ وارانہ فسادات نے تشدد اور منافرت کی آندھی چلا رکھی تھی ۔ بنگال سے فسادات بہار تک جا پہنچے اور پھر یہ سلسلہ بڑھتا گیا ۔ انگریز افسر بھی انتظامی معاملات میں کم دلچسپی لینے لگے کیونکہ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ انھیں جلد ہی ہندستان چھوڑ کر وطن واپس جانا پڑے گا ۔ جواہر لال کی عبوری حکومت میں اندرونی اختلافات بڑھتے جا رہے تھے ۔ وزیر خزانہ لیاقت علی خاں نے ایک ایک پیسے پر مہر لگا رکھی تھی ہندستان کے فوجی بھی مطمئن نہ تھے ۔ انھیں تمام باتوں نے ماؤنٹ بیٹن پر یہ اثر ڈالا کہ فرقہ واریت کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک لیگ کا مطالبہ پورا نہیں ہو جاتا ۔ اس لیے انھوں نے وطن کی تقسیم ہی کو تمام خرابیوں اور برائیوں کا علاج تصور کیا ۔ انھوں نے بڑی سوجھ بوجھ سے ہندستان کی تقسیم کے منصوبہ کا خاکہ تیار کیا اور اس تقسیم کے لیے جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے رہنماؤں کو تیار کر لیا جب مولانا آزاد کو وائسرائے کے نئے منصوبہ کا علم ہوا تو انھوں نے کانگریسی رہنماؤں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی کیونکہ بٹوارا نہ صرف مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھا بلکہ اس میں پورے ملک کا نقصان تھا ۔ ان کے نزدیک کابینہ مشن کا منصوبہ ہی تمام مسئلوں کا حل تھا اس کے تحت نہ صرف ملک متحد رہ سکتا تھا بلکہ سبھی فرقوں کو کام کرنے کے یکساں مواقع فراہم ہو سکتے تھے ۔ مولانا سمجھتے تھے کہ ملک کا اصل مسئلہ اقتصادی تھا نہ کہ سیاسی یا فرقہ وارانہ ۔ انھیں یقین تھا کہ ملک کو آزادی حاصل

ہوجانے کے بعد ہندو، مسلمان اور سکھ مسئلوں کی اصل صورت سے واقف ہوجائیں گے اور تب فرقہ وارانہ مسئلہ بھی آپسی کوششوں سے حل کرلیا جائے گا۔ مولانا کا خیال تھا کہ بٹوارہ نہ کرکے آزادی کو دو ایک برس کے لیے ٹال دیا جائے کیونکہ قوموں کی زندگی میں دو ایک برس کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس مدت میں حالات معمول پر آجائیں گے، منافرت کم ہوجائے گی اور تشدد ختم ہوجائے گا تب لیگ پاکستان کا اپنا مطالبہ بھی ترک کردے گی اور ہندستان ایک متحد ملک کی شکل میں آزادی حاصل کرلے گا لیکن بہت سے رہنماؤں نے ان کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ مولانا اس سلسلہ میں وائسرائے سے بھی ملے مہاتما گاندھی پہلے تو مولانا کے خیالات سے متفق تھے اور کہتے تھے کہ بٹوارا ان کی لاش پر ہی ممکن تھا مگر پھر وہ بھی اس کے حامی ہوگئے۔ مولانا نے واضح الفاظ میں کہا کہ "اگر ہم نے بٹوارے کو منظور کرلیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی اس وقت یہی کہا جائے گا کہ ہندستان کو بانٹنے میں کانگریس کا بھی اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا کہ مسلم لیگ کا" مگر ان کے خیالات سے کسی نے اتفاق نہ کیا۔

۳ رجون کو ماؤنٹ بیٹن نے ملک کے بٹوارے سے متعلق اپنی تجویز کا خاکہ پیش کیا جسے کانگریس اور لیگ، دونوں ہی نے منظور کرلیا۔ اس طرح ایک متحد ملک کا جو خواب مولانا نے دیکھا تھا وہ چور چور ہوگیا۔ ۱۴ راگست کو ایک نئے ملک یعنی پاکستان کا قیام عمل میں آگیا جو سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد، پنجاب کے مغربی اور بنگال کے مشرقی حصّوں کو ملاکر بنایا گیا تھا۔ اگرچہ صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور بٹوارے کی مخالفت کی تھی لیکن ان کے صوبہ کو بھی پاکستان میں شامل ہونا پڑا۔ ۱۵ ر اگست کی صبح جواہر لال نہرو نے دلّی کے تاریخی لال قلعہ کی فصیل پر ترنگا جھنڈا لہراکر آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے تقریر کی اور اس طرح ملک برطانوی تسلّط سے آزاد ہوگیا جس کے لیے جدّوجہد کرنے والوں میں مولانا

آزاد کا نام سرفہرست ہے مگر مولانا کا خواب ریزہ ریزہ ہو گیا تھا کیونکہ انھوں نے تو ایک متحد ہندستان کی آزادی کے لیے جنگ کی تھی

ملک آزاد تو ہوا مگر بٹوارے نے دلوں کو بوجھل بنا دیا۔ ہندستان اور پاکستان کے دونوں ہی حصّوں سے لوگ منتقل ہونے لگے۔ فسادات روزمرّہ کا معمول بن گئے۔ زندگی کی کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ مذہب کا کام دلوں کو جوڑنا ہے لیکن لوگوں نے اس سے دلوں کو توڑنے کا کام لیا۔ دلّی بھی اس زہر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ یہاں بھی نفرت اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ مولانا کو بٹوارے نے شدید صدمہ پہنچایا تھا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ بٹوارا ملک کے مسئلوں کا حل نہیں، اس سے نئے نئے مسئلوں کے ابھرنے کا اندیشہ تھا۔ اب ان کے یہ اندیشے صحیح ثابت ہو رہے تھے تاہم انھوں نے پوری کوشش کی کہ ملک میں امن قائم ہو جائے لوگوں کے دلوں سے انتقام اور نفرت کی آگ ختم ہو جائے اور محبّت اور بھائی چارہ کی فضا میں ہندو اور مسلمان دوستی کی جڑوں کو مضبوط کریں۔

مولانا نے ہندستان کے مسلمانوں کے دلوں سے خوف کے ہر احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان کے اندر سے احساسِ کمتری کو مٹانے کے لیے ان میں اعتماد پیدا کیا اس سلسلہ میں وہ گورنر جنرل، وزیر اعظم اور دوسرے تمام وزیروں سے ملتے رہے۔ ان کی کوٹھی مسلمانوں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ بن گئی۔ جہاں انھوں نے خیمے نصب کروا دیے تاکہ خوف زدہ مسلمان ان میں پناہ لے سکیں۔ انھوں نے ہندستان چھوڑ کر پاکستان جانے والے مسلمانوں کو اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دلّی کی تاریخی جامع مسجد میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"۔۔۔۔ آج ہندستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے

شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ عزور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔۔۔۔ مجھے آج جو کہنا ہے میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندستان کا بٹوارا بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر اب تک دیکھ رہے ہیں۔"

مولانا نے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتے ہوئے کہا:

"ہراس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بے عملی کو ترک کر دو، یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں سے سُنی ہیں۔"

جو لوگ پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکے تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے کہا:

"یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدّس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو۔ تمھیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو، مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم کو یہاں

رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دِلّی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔"

مولانا نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ نئے حالات کے مطابق اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ نہ انھیں ڈرنے کی ضرورت تھی اور نہ پریشان ہونے کی۔ انھیں صرف اپنے خدا پر یقین ہونا چاہیے اور اس پیغام پر عمل کرنا چاہیے جو پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ رسول اللہ نے چودہ سو برس پہلے دنیا کو دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب کا ایک دور پورا ہو چکا ہے مگر ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں۔ ان خالی صفحات کا عنوان خود مسلمان بن سکتے ہیں " مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہیں . . . ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو، اور ان اندھیری راتوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔" مولانا نے کہا کہ مسلمانوں کو کسی سے وفاداری کی سند لینے کی ضرورت نہیں۔ ہندستان پر اُن کا حق اسی طرح اور اسی قدر ہے جس قدر دوسروں کا تھا۔ مولانا نے اخیر میں کہا:

> "آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اسی کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے . . . آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیروں سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں وہ تمھارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرائے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا 'تمھارا راستہ یہ نہیں ہے'۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا . . . عزیزو، میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ

نہیں ہے ۔ چودہ سو برس پہلے کا نسخہ ہے ، وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا ۔"

مولانا کی تقریر نے مسلمانوں کو اس قدر متاثر کیا کہ ہندستان چھوڑ کر جانے والے بہت سے لوگوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور وہ ہندستان ہی میں رہنے اور بسنے پر تیار ہو گئے۔ بندھے ہوئے بستر کھل گئے اور لوگوں کے بھاگتے ہوئے قدم ٹھہر گئے۔

مولانا کے لیے یہ زمانہ بڑی پریشانی کا تھا۔ نہ انھیں دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ وہ رات رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے اور ملک کے حالات پر نظریں دوڑاتے رہتے تھے ۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب ہر جگہ یہی بحث تھی کہ "مسلمان اب کیا کریں"۔ اسی سوال کا جواب دینے کی غرض سے مولانا کے ایما پر لکھنؤ میں ایک مسلم کنونشن منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی۔ مولانا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو وہی مشورہ دیا جو وہ ہمیشہ دیتے آئے تھے۔ انھوں نے کہا :

> "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان جس کی آزادی کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے - برباد نہ ہو اور بربادی کسی دروازے میں نہ گھسنے پائے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ جس دروازے سے فرقہ پرستی آئی ہے اس دروازہ کو بند کر دیں۔ ایک دروازہ جو مسلمانوں کے ذریعہ کھولا گیا تھا اسے بند کر دینا چاہیے۔ ہر شخص جو اپنی آنکھوں کے پپوٹوں کو کھلا رکھنا چاہتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس سے بڑھ کر خطرناک کوئی چیز نہیں ۔ اگر وہ دروازہ اب بھی بند نہیں کیا جاتا ہے تو بہت بڑی ذمہ داری آپ پر رہ جائے گی اور ملک کی آب و ہوا کی خرابی کی اصلاح میں جو کوشش کی جارہی ہے اس میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی ۔"

اس طرح مولانا نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ فرقہ پرستی کی سیاست کا خاتمہ کر دیں۔ ایسی سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیں جو ملک کا بٹوارہ چاہتی تھیں اور جنھیں تقسیم

کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ وہ آئندہ ایسی کوئی جماعت نہ بنائیں جو فرقہ پرستی کی بنیاد پر کھڑی ہو بلکہ اب انھیں ایسی جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے جو ترقی پسند ہو، فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ بنی ہو، جو ان کے مقاصد کو پورا کرتی ہو، جو ہندو مسلم، سکھ، عیسائی میں فرق نہ سمجھتی ہو۔ انھوں نے واضح طور سے کہا کہ ان کے نزدیک ایسی ترقی پسند جماعت محض کانگریس ہے۔ اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہو جانا چاہیے۔

ایک طرف مولانا ہندستان کے مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جذبہ جگا رہے تھے تو دوسری طرف مہاتما گاندھی بھی ایک نئے ہندستان کی تعمیر کے سلسلہ میں فرقہ واریت کا خاتمہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن دنوں وہ دلی میں برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں انھیں ہندو مسلم فسادات اور منافرت کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ انھوں نے اس بارے میں وزیر داخلہ سردار پٹیل سے معلومات حاصل کیں مگر جب اطمینان نہ ہوا تو مولانا کو بلا کر یہ فیصلہ سنایا کہ وہ ملک میں امن قائم کرنے کی غرض سے برت رکھیں گے۔ مہاتما گاندھی ہندستان کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ برت رکھ چکے تھے مگر اب جب کہ ان کی عمر اٹھتر برس کی تھی، جسم جیلوں کی سختیاں سہتے سہتے لاغر ہو چکا تھا اور بٹوارے نے ان کے دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا ایسی حالت میں آزاد ہندستان میں ان کے برت رکھنے کے فیصلہ نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مولانا اور جواہر لال نے بڑی کوشش کی کہ مہاتما جی اپنا فیصلہ بدل دیں مگر گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخرکار انھوں نے برت رکھ ہی لیا

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کے اصرار پر مہاتما جی نے اپنا برت توڑنے کے لیے کچھ شرطیں رکھیں جن میں سے خاص یہ تھیں کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں پر حملے کرنا بند کر دیں، ان کے ساتھ بھائی چارہ کا سلوک کریں، انھیں پاکستان جانے سے روکیں، چلتی گاڑیوں پر حملہ نہ کریں اور دوسروں کو بھی ان سے باز رکھیں، جو مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر مختلف جگہوں میں پناہ لے رہے تھے

انھیں واپس لائیں اور فساد کے دوران میں مہرولی میں واقع قطب صاحب کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی مرمت کروائیں۔ مولانا نے مہاتما جی کی یہ شرطیں ایک عام جلسہ میں پیش کیں اور لوگوں کے تسلیم کرنے کے بعد گاندھی جی کو یقین دلایا کہ جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا اس طرح مولانا کے یقین دلانے پر انھیں کے ہاتھ سے موسمی کے رس کا گلاس پی کر مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی کا آخری برت توڑ دیا۔

مہاتما گاندھی اُن دنوں دِلّی میں برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہر شام اس کوٹھی کے پچھلے حصّہ میں ان کی پرارتھنا سبھا ہوتی تھی جہاں ہر فرقہ اور طبقہ کے لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ مہاتما جی اپنی تقریر میں ملک کے حالات پر روشنی ڈالتے، لوگوں کے اندر سے نفرت مٹانے کی بات کرتے اور اہنسا اور ستیہ کے راستہ پر چلنے کی ہدایت کرتے تھے۔ روزانہ کی طرح ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام میں بھی معمول کے مطابق مہاتما جی پرارتھنا سبھا میں پہنچے ہی تھے کہ ناتھو رام گوڈسے نامی ایک شخص نے اپنی پستول سے تین فائر کر کے انھیں شہید کر دیا۔ مولانا آزاد کو مہاتما جی کے اس حادثہ سے بڑی سخت تکلیف پہنچی۔ وہ مہاتما جی کے بہت عزیز رفیقوں میں تھے اور اٹھائیس برس تک ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔ یہ غم اگرچہ سارے ہندستان کے لوگوں کا غم تھا مگر آزاد اور نہرو کے لیے تو کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ مولانا نے مہاتما جی کی یاد میں منائے جانے والے ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی "دنیا کی تمام حدبندیوں سے اوپر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ کی حیثیت یکساں تھی اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے"۔ ان کو "دنیا کی حدبندیوں نے جکڑنے کی کوشش کی مگر وہ الجھ نہ سکے۔ بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا مگر وہ گرفت میں نہ آسکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی بڑائی یہی ہے"۔

وزارت

مولانا آزاد ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء سے ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء تک یعنی کم و بیش گیارہ برس ہندستان کے وزیر تعلیم کے اعلا منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۵۲ء کے عام انتخابات میں وہ رام پور سے لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے تو دوسری بار ۱۹۵۷ء میں انھوں نے ہریانہ کے گوڑگانوٗ نامی حلقۂ انتخاب سے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ اس پوری مدّت میں وہ پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر رہے اور وزیراعظم نہرو کے مشیر بھی۔

مولانا آزاد نے جب قلم دانِ وزارت سنبھالا تھا تبھی یہ محسوس کرلیا تھا کہ تعلیمی مشکلوں کو مرکز اور ریاستی حکومتوں کے تعاون کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں انھوں نے جتنے اقدامات کیے ان میں ریاستوں کی مدد شامل رہی اپنے تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کی غرض سے اپنی وزارت کے سکریٹری کی حیثیت سے مولانا نے ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر ہمایوں کبیر اور خواجہ غلام السیدین جیسے ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کیں انھوں نے آزاد ہندستان میں تعلیم کے تقاضوں کو سمجھا اور انھیں کے مطابق تعلیم کو جمہوری بنانے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہناتے میں مصروف رہے ان کے دورِ وزارت میں اسکول جانے والی عمر کے سبھی بچّوں کے لیے بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دیا گیا لوگوں کی ناخواندگی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا کر انھیں خواندہ بنانے کی اسکیم پر عمل درآمد شروع ہوا پنج سالہ منصوبوں میں تعلیم کی اہمیت کو

اجاگر کیا گیا۔ بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے کالج کھولے گئے اور اسکولوں کو بنیادی اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سکینڈری ایجوکیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا، سماجی تعلیم کو اہمیت حاصل ہوئی اور سکینڈری ایجوکیشن کی آل انڈیا کونسل قائم ہوئی۔ بڑی تعداد میں اساتذہ کا تقرر کیا گیا اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا۔

عالمی جنگ کے نتیجہ میں بچّوں کی ایک بڑی تعداد اپاہج ہو گئی تھی مولانا کی وزارت نے ان معذور بچّوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا اسی طرح معذور لوگوں کے لیے بھی ادارے قائم کیے۔ بڑوں کی تعلیم کے لیے تعلیم بالغان کا منصوبہ بنایا گیا ان کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں شبینہ اسکول کھولے گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اقوام متحدہ کے ادارہ یونسکو سے بھی مدد لی۔ مولانا کی وزارت نے ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ بچّوں اور نوجوانوں کی جسمانی نشو و نما کی طرف بھی توجہ کی اور ملک میں فزیکل ایجوکیشن کالج کھولے۔ اولمپک، ایشیائی اور دوسرے کھیلوں میں ہندستان کی نمایندگی کے لیے کھلاڑیوں کو تیار کیا۔ اسکاؤٹس اور گرل گائڈس کی حوصلہ افزائی کی۔

اعلا تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے مولانا آزاد کی وزارت نے خصوصی اقدامات کیے۔ یونی ورسٹیوں کی اصلاح اور ان کی از سر نو تنظیم کے لیے انڈین یونیورسٹیز کمیشن قائم ہوا۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کا کام یہ تھا کہ وہ یونی ورسٹیوں کی مالی اعانت کرے۔ اس زمانے میں نئی نئی یونی ورسٹیاں قائم ہوئیں اور سارے ملک میں کالجوں کا جال بچھ گیا اور تحقیق کے لیے راہیں ہموار ہوئیں

اگرچہ بنیادی طور پر مولانا آزاد ایک ادیب تھے لیکن دوسرے علوم و فنون پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ان کا مزاج سائنسی تھا۔ اسی لیے انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تعلیم کو وسعت دینے کی غرض سے کئی کمیشنوں، کونسلوں اور تحقیقی اداروں کو قائم کیا۔ انھیں کے ایما پر تکنیکی تعلیم کے

اداروں کو فروغ حاصل ہوا۔

مولانا نوجوانوں کی سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے لیے یوتھ فیسٹیولوں کا انعقاد کرایا، ڈراما، رقص، موسیقی اور دوسرے میدانوں میں ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے لیے انعامات کا سلسلہ شروع کیا اور ایک انٹرنیشنل ہاؤز قائم کیا۔ انھوں نے ہندستان کے طلبہ کے لیے بیرونی ملکوں میں اعلا تعلیم کے مواقع فراہم کیے۔

مولانا اگرچہ خود مشرقی علوم کے عالم تھے مگر انھوں نے ہندی اور سنسکرت کے فروغ کے لیے بھی منصوبے بنائے اور ان پر عمل درآمد کرایا۔ مختلف زبانوں کے ادیبوں کے لیے وظیفے شروع کرائے اور ان کی مالی امداد کے لیے وسائل مہیا کیے۔

مولانا نے اپنی وزارت کے دور میں تین اکادمیاں قائم کیں جو ساہیتہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی کے نام سے مشہور ہیں۔ ساہیتہ اکادمی ہندستانی ادیبوں کی تخلیقات چھاپتی ہے، انھیں علاقائی زبانوں میں شائع کرتی ہے اور ادیبوں اور شاعروں کو انعامات دیتی ہے۔ مولانا کی وفات کے بعد ساہیتہ اکادمی ہی نے ان کی کتابوں کو شائع کیا سنگیت ناٹک اکادمی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، موسیقی اور ڈرامے کے فن کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی۔ اسی طرح مصوّری، مجسمہ سازی جیسے فنون کو فروغ دینے کے لیے للت کلا اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ ادب سے متعلق ایک اور ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ کے نام سے قائم کیا گیا جس میں مختلف موضوعات پر کتابیں چھاپی جاتی ہیں اور بہت سستی قیمت میں فروخت کی جاتی ہیں۔ انھوں نے بچّوں کے ادب کے لیے بھی ایک ٹرسٹ کے قیام میں مدد دی۔

اسی طرح مولانا نے آزاد ہندستان میں کئی نئے اداروں کو وقت کی ضرورت کے تحت یا تو قائم کیا یا نئے سرے سے قائم شدہ اداروں کی تنظیم کی نیشنل گیلری

آف آرٹ، نیشنل میوزیم، نیشنل آرکائیوز، نیشنل لائبریری، اسی قسم کے کچھ ادارے ہیں۔ انھوں نے محکمہ آثار قدیمہ کی طرف خصوصیت سے توجہ دی جس کا کام یہ ہے کہ قدیم عمارتوں کی حفاظت کا انتظام کرے۔ اس سلسلہ میں اہم کتابیں بھی چھاپی گئیں۔ سماجی اور فلاحی کاموں کے لیے ایک سوشیل ویلفیر بورڈ قائم کیا گیا۔

برطانوی حکومت کے دور میں ہندستان کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا تھا اور حقائق کو چھپا کر ایسی باتیں پھیلانے کی کوشش کی جاتی تھی جس سے ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان نفرت ابھرے۔ مولانا کے نزدیک برطانوی مورخوں کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابیں نہ صرف غلط تھیں بلکہ ان سے ملک کی سالمیت پر ضرب پڑتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے ملک میں آزادی کی تاریخ کو نئے سرے سے لکھوانے کا انتظام کیا۔ یہ تاریخ ڈاکٹر تاراچند جیسے نامور مورخ کی صدارت میں بنائے گئے ماہرین کے ایک بورڈ نے تیار کی جو چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

مولانا آزاد ہندستانی ثقافت کے علمبردار تھے۔ وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ثقافتی سطح پر ہندستان کے تعلقات قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور وزارت میں ثقافت اور اس سے متعلق اداروں کو بہت فروغ ملا۔ اس سلسلہ میں ثقافتی وظیفے دیے گئے اور عالموں اور فنکاروں کو دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا اور وہاں سے اسی قسم کے لوگوں کو خوش آمدید کہا گیا اس مقصد سے مولانا نے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نامی ایک ادارہ قائم کیا۔ آج اس ادارہ کا قیام جس عمارت میں ہے اسے مولانا آزاد ہی کی یاد میں آزاد بھون کا نام دیا گیا ہے جہاں مولانا آزاد کا ذاتی کتب خانہ بھی موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے غیر ملکوں کے خیرسگالی دورے کیے اور دنیا کے بیشتر ملکوں کو ہندستان کے قریب آنے میں مدد کی۔

غرض کہ مولانا نے گیارہ برس کی مدت میں جو بیش قیمت خدمات انجام

دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ دراصل تعلیم کی وزارت کا عہدہ مولانا کے سپرد کر کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ہندستان میں تعلیم کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا اہم کام انجام دیا۔ آج ہندستان میں تعلیم کو جو فروغ حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد مولانا ہی نے رکھی تھی اور جو ادارے انھوں نے قائم کیے تھے وہ کامیابی اور حسن وخوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں خواجہ غلام السیدین کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"مولانا ہر لحاظ سے ایک معلّم تھے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی تصنیفات میں لکھا اس کی تعلیم بھی دی۔ ان میں خود وہ ذہانت تھی اور کردار صالح موجود تھا جسے وہ ملک کے عوام کو دینا چاہتے تھے وہ صداقت واخلاص کی تصویر تھے۔ انھوں نے سقراط کی طرح حق وصداقت کی حمایت کی، یہ وہ صداقت تھی جس کو مصلحتیں باز نہیں رکھ سکتیں اور جو کسی طرح غلط تنقید یا مخالفت سے نہیں ٹل سکتی تھی... انھوں نے انسانی قدروں کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھا اور پایا کہ اس ملک میں لوگ ایسے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں بعض کو سماجی مساوات اور جمہوری برابری حاصل نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہریجنوں اور قبائلی پسماندہ طبقوں کے لیے وظائف کی ایک اسکیم جاری کی جو اُن کے زمانہ میں تین لاکھ روپے سالانہ سے بڑھ کر دو کروڑ روپے سالانہ تک پہنچ گئی ... مختلف ملکوں کے ساتھ ثقافتی روابط کا مبادلہ ہوا جس سے باہمی رواداری اور محبّت میں اضافہ ہوا ... مولانا خود ایک مصنّف اور اعلا کلچر کے آدمی تھے۔ انھوں نے ایک اسکیم بنائی جس سے مستحق مصنفوں، شاعروں اور فنکاروں کو امداد دی جاتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ اس قسم کی امداد تو ہندستانی حکومتوں اور درباروں کا عام وطیرہ رہا ہے ... انھوں نے ہندی کی

ترویج و ترقی کے لیے پروگرام بنایا ان کی خاص طور پر یہ ہدایت تھی کہ اس پر اس انداز سے عمل ہو کہ ہندستان کی دوسری زبانوں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ حصول آزادی کے جوش میں کچھ جوشیلے لوگوں نے انگریزی کو ملک بدر کرنے کی تجاویز پیش کیں تو مولانا نے، جو خود مشرقی طرز تعلیم کے پروردہ تھے، اسے منظور نہیں کیا بلکہ اس بات پر اصرار کیا کہ انگریزی نہ صرف قائم ہی رہے بلکہ اسے قومی زندگی میں اعلا مقام بھی حاصل ہو۔ . ."

تصانیف

مولانا آزاد نے بڑی چھوٹی عمر میں لکھنے لکھانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ مختلف رسالوں اور جریدوں میں ان کے مضامین چھپنے لگے تھے اور پھر انھوں نے خود بھی کئی پرچوں کی ادارت کی۔ اس طرح ان کے قلم سے بے شمار مضامین نے جنم لیا۔ لیکن ان کی اہم تصانیف وہ ہیں جو جیل میں لکھی گئیں۔ اگر شمار کیا جائے تو ان کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے مگر ان میں مندرجہ ذیل نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

(۱) ترجمان القرآن

مولانا آزاد ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے جہاں اسلام اور ارکان اسلام ہی گفتگو کا موضوع بنے رہتے تھے۔ قرآن پاک اور حدیث کا ذکر رہتا تھا۔ اس مذہبی اثر نے ان کی زندگی میں بھی قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے معنیٰ کو حقیقت کا روپ دیا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہفت روزہ "الہلال" میں کلام پاک کی تفسیر کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پھر جب مولانا رانچی میں قید کیے گئے تو وہاں انھوں نے اسے تکمیل کو پہنچانے کا بیڑا اٹھایا اور اسے

تقریبًا پورا بھی کر لیا مگر ان کا یہ سرمایہ ضائع ہو گیا۔ تاہم انھوں نے دوبارہ اسے شروع کیا اور اٹھارہ پاروں کی تفسیر پر ختم کر دیا۔ جسے "ترجمان القرآن" کے نام سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی یہ تفسیر علم کا بیش بہا خزانہ ہے۔ جس میں مختلف انداز سے قرآن پاک کے معنیٰ اور مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۲) تذکرہ

"تذکرہ" میں مولانا کے خاندان کی تفصیل ملتی ہے۔ دراصل جب وہ "البلاغ" کی ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد رانچی میں نظر بند کیے گئے تو ان کے پرانے ساتھی اور عقیدت مند فضل الدین صاحب کے اصرار پر اپنی زندگی کے حالات لکھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے جو کچھ بھی لکھا وہ اسے فضل الدین صاحب کو بھیجتے رہے مگر مولانا نے اپنی زندگی کے حالات کم اور اپنے خاندان کے اجداد کی تفصیلات زیادہ رقم کیں فضل الدین نے "تذکرہ" کی پہلی جلد شائع ہی کی تھی کہ دوسری جلدوں کے مسودے ضائع ہو گئے۔ اس طرح مولانا کے خاندان سے متعلق تفصیل پر مشتمل "تذکرہ" ایک اہم تصنیف ہے جس میں مولانا نے خود اپنی پیدائش اور ابتدائی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

(۳) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی

۱۹۱۶ء میں نظر بند ہونے کے بعد مولانا پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے "ترجمان القرآن" اور "تذکرہ" پر کام کیا مگر ۱۹۲۱ء میں وہ خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ اس سزا کے دوران میں انھوں نے جیل میں اپنے پرانے ساتھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے اصرار پر انھیں اپنے والد اور خود اپنی زندگی کے اہم حالات لکھوا دیے۔ اس کتاب میں بہت سی ایسی باتیں تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں جن کا تعلق مولانا

کی زندگی سے تھا۔ اسی لیے مولانا ملیح آبادی نے اس تصنیف کا عنوان " مولانا آزاد کی کہانی خود مولانا آزاد کی زبانی" تجویز کیا جسے مولانا کے انتقال کے بعد شائع کیا گیا۔

(۴) غبار خاطر

"غبار خاطر" مولانا کے قلم کی آخری یادگار ہے جو انھوں نے ہندستان کی آزادی کے سلسلہ میں اپنی آخری قید کے دوران تصنیف کی۔ دراصل اس میں مولانا کے وہ تمام خط شامل ہیں جو انھوں نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنی قید کے دنوں میں اپنے دوست نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمان شیروانی، رئیس بھیکم پور کے نام لکھے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی خط کبھی ڈاک کے سپرد نہیں کیا جا سکا۔ کیونکہ قلعہ سے خط لکھنے کی ممانعت تھی دراصل مولانا نے اپنا جی بہلانے کی غرض سے خط لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کے نتیجہ میں ایک اچھا خاصا فائل بن گیا رہائی کے بعد مولانا نے یہ تمام خط اپنے سکریٹری اجمل خاں کے سپرد کر دیے تاکہ وہ انھیں نواب صدر یار جنگ کو بھجوا دیں مگر اجمل خاں کے اصرار پر مولانا اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے جسے "غبار خاطر" کا نام دیا گیا۔ اس تصنیف میں مولانا نے کہیں کہیں ذاتی حالات کا ذکر کیا ہے لیکن بیشتر خطوں میں ادب، شاعری، تاریخ، فلسفہ سے متعلق انتہائی معلوماتی مضامین قلم بند کیے ہیں۔ ان خطوں میں مولانا کا وہ دردناک خط بھی شامل ہے جو انھوں نے اپنی بیگم کی وفات اور بیماری سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اس طرح خطوط کی شکل میں "غبار خاطر" ایک شاہکار تصنیف بن گئی جس میں مولانا کی علمیت، قابلیت اور اہلیت کے نمونے ملتے ہیں۔

(۵) ہماری آزادی

مولانا کی آخری تصنیف "انڈیا ونس فریڈم" ہے جسے "ہماری آزادی" کے

عنوان سے اردو میں شائع کیا گیا۔ دراصل مولانا کی یہ کتاب ان کی سیاسی زندگی اور ہندستان کے سیاسی حالات پر مشتمل ہے جسے لکھوانے کا سہرا ہندستان کے نامور رہنما اور دانشور پروفیسر ہمایوں کبیر کے سر ہے جنھوں نے مولانا کو اس اہم دور کے حالات پر زبان کھلوانے کے لیے رضامند کرلیا۔ مولانا نے اس کتاب کو پروفیسر کبیر کو زبانی لکھوایا تھا جسے پروفیسر صاحب نے انگریزی میں ترجمہ کرکے مولانا کی وفات کے بعد شائع کروایا۔ اس کتاب کے تیس صفحے مولانا کی وفات کے تیس سال بعد کھولے جانے تھے جنھیں پروفیسر کبیر نے نیشنل آرکائیوز دہلی اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں محفوظ کر دیا تھا۔ مگر ۲۲ر فروری ۱۹۸۸ء گزر جانے اور تیس سال پورے ہوجانے کے باوجود ان صفحات کو شائع نہیں کیا جاسکا اور معاملہ عدالت تک جا پہنچا۔ تاہم عدالت نے ۳۰ر ستمبر ۸۸ء کو انھیں کھلوا کر کتاب کے ناشر کے حوالے کر دیا۔

ان تیس صفحوں میں مولانا نے صوبائی اور قومی اہمیت کے کچھ ایسے واقعات کی نشاندہی کی ہے جن سے ملک کو نقصان پہنچا۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں بہار میں وزارتِ عظمیٰ کے لیے امیدوار چننے کے سلسلہ میں کانگریس کی کوتاہی پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح انھوں نے کانگریس کے اعلا رہنماؤں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جنھیں انھوں نے ملک کے بٹوارے کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ مولانا نے ایک ایسے رہنما کے بارے میں لکھا ہے جنھیں وہ خود تو ناپسند کرتے تھے مگر جواہر لال انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ مولانا اگرچہ پنڈت نہرو سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے بڑے مدّاح تھے مگر وہ ان کی بہت سی باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ تاہم وہ پنڈت جی کی ان کوتاہیوں کو اپنی یا ان کی زندگی میں بے نقاب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان تمام حقیقتوں سے متعلق ان کے خیالات کا اظہار انھوں نے تیس سال کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

ان تصانیف کے علاوہ مولانا کی تقریروں کے بہت سے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں جنھیں

خطبات آزاد کا عنوان دیا گیا۔ حکومت ہند نے بھی مولانا کی تقریروں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ بہت سے ناشروں نے "الہلال" اور "البلاغ" کے اہم مضامین کو یکجا کر کے مختلف عنوانات سے شائع کیا ہے۔ اسی لیے ۱۹۲۱ء میں گرفتاری کے بعد مولانا کا وہ بے باکانہ بیان بھی جو انھوں نے عدالت میں تحریری شکل میں داخل کیا تھا، 'قول فیصل' کے نام سے شائع ہوا۔ اس بیان کو مولانا کی جرأت مندی اور دلیری کی زبردست مثال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس میں انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح خلافت کی تحریک کے دوران میں اس مسئلہ پر مولانا کی مختلف تحریروں کو بھی مختلف عنوانات سے شائع کیا جا چکا ہے۔

مولانا کی حیات میں ان کی خط و کتابت مختلف لوگوں سے رہی۔ انھوں نے ہزاروں خطوں کے جواب لکھے جو اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح ان کے خطوط کے بہت سے مجموعے شائع ہو گئے جو 'کاروانِ خیال'، 'نقش آزاد'، 'تبرکاتِ آزاد'، 'ملفوظات آزاد'، 'مکاتیب ابوالکلام آزاد'، 'نگارشات آزاد' اور 'مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات' کے عنوانات کے تحت شائع ہوئے۔ ان تمام خطوں میں مولانا کے سوچنے کے انداز، مسئلوں کے بارے میں ان کے خیالات اور اسی طرح کی دوسری بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

مولانا کی یہ تمام تحریریں اور کتابیں بڑی اہم ہیں جن پر تحقیق کام ہو رہا ہے۔

وفات

مولانا آزاد اپنے معمول کے بڑے پابند تھے۔ وہ صبح چار بجے جاگ اُٹھتے تھے۔ دو تین پیالیاں چائے کی پی کر وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کتابوں اور اخباروں پر نظر دوڑانے کے بعد وہ غسل کرتے اور پھر ناشتا کرنے کے بعد ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ وہاں وہ لوگوں سے ملاقات کرتے، دفتر کے کام نمٹاتے اور سرکاری میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے۔ ایک بجے دوپہر کھانے کے لیے گھر پہنچتے اور ڈھائی بجے دوبارہ دفتر پہنچ کر شام میں پانچ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے کام کرتے تھے۔ ان کی میز پر نہ تو کبھی کوئی فائل باقی رہی اور نہ ہی کوئی کاغذ نامکمل رہا۔ شام میں گھر پہنچ کر مولانا چائے سے شوق کرتے اور پھر پڑھنے لکھنے میں گم ہو جاتے تھے۔ وہ رات کا کھانا نو بجے کھانے کے بعد دس بجے تک سو جاتے تھے۔ وہ دِلّی میں ہوں یا دِلّی سے باہر۔ ان کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔

کاموں کی کثرت، مسلسل محنت، اور فرصت کی کمی نے مولانا کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کے دس سال اور سات مہینے برطانوی حکومت کی جیلوں میں گزرے تھے اور آزادی حاصل کرنے کے بعد کا زمانہ نئی نئی

پریشانیوں کا سامنا کرنے، نئے ہندستان کی تعمیر کے سلسلہ میں آنے والے مسئلوں کو سلجھانے میں صرف ہوا۔ یہی سبب ہے کہ مولانا کی صحت جواب دینے لگی لیکن انھوں نے اس کی کبھی پروانہ کی اور اپنی ہر مصروفیت کو خوبی سے نباہتے رہے۔ ۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو دلّی کے لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع تاریخی میدان میں ایک اردو کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مولانا اردو کے ادیب اور خطیب تھے، اسی زبان میں انھوں نے کتابیں لکھیں اور اسی زبان میں انھوں نے اپنے وطن والوں سے خطاب کیا تھا۔ دراصل وہ اردو کے عاشق تھے، پارلیمنٹ میں بھی وہ اردو کی حمایت میں بڑی شاندار تقریر کر چکے تھے اس لیے جب اردو کانفرنس والوں نے انھیں مدعو کیا تو مولانا اس میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ کانفرنس کا افتتاح وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کیا اور مولانا نے اس میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ :

"اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے، نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد، تلنگانہ کے علاقے میں اردو بولی جاتی ہے، میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یوپی، بہار، دلّی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں کے لاکھوں اور ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لیے بلائی گئی ہے اس میں کامیابی ہوگی۔ اور جب کہ وزیر اعظم نے اس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"

دراصل آزادی کے حصول کے بعد اردو والے حکومت سے اس کا حق مانگ رہے تھے جب کہ فرقہ پرست عناصر اسے ایک بدیسی زبان قرار دیتے تھے اور اسے بٹوارے کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اسی لیے مولانا نے اس زبان کے حق میں تقریر کی۔ یہ مولانا کی آخری تقریر تھی جو انھوں نے عوام کے کسی جلسہ میں کی کیونکہ اس کے بعد لوگ ان کی آواز

سننے کے لیے ترس گئے۔

۱۹ر فروری ۱۹۵۸ء کی صبح میں اچانک مولانا آزاد پر فالج کا حملہ ہوا۔ فوری طور پر طبی امداد بہم پہنچائی گئی مگر مولانا بے ہوش رہے۔ ایک دو بار ہوش آیا۔ لیکن وہ کسی کو پہچان نہ سکے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور معالجوں نے کوشش کی مگر مولانا جانبر نہ ہو سکے اور بالآخر ۲۲ر فروری کی صبح دو بج کر دس منٹ پر ان کی زندگی کی وہ شمع ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی جس سے ملک روشن تھا ۔ اسی دن سہ پہر میں لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع اسی تاریخی میدان میں انھیں اسی جگہ دفنا دیا گیا جہاں کچھ روز پہلے انھوں نے اردو کے حق میں آخری تقریر کی تھی۔ اس طرح ۱۸۸۸ء میں مکّہ کے مقدس شہر سے شروع ہونے والی داستان کا یہ لمبا سفر پُرپیچ راہوں اور عجیب و غریب منزلوں سے ہوتا ہوا ۱۹۵۸ء میں ہندستان کے تاریخی شہر دلّی میں ختم ہو گیا ــــــــ!!

عقیدت کے پھول

مولانا آزاد کی وفات ایسا الم ناک سانحہ تھی جس نے ہر دل کو درد سے چُور اور ہر آنکھ کو آنسوؤں سے تر کر دیا۔ وہ جس قدر بڑے عالم تھے اسی قدر عظیم انسان بھی تھے۔ ان کے ساتھیوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس پر اُن کی چھاپ موجود نہ ہو۔ کوئی ان کی علمیت سے متاثر تھا تو کوئی ان کے عمل سے۔ کسی نے ان کے تدبر سے سبق لیا تو کسی نے ان کی دانش وری سے۔ کوئی ان کی شرافت کا معترف تھا تو کوئی ان کی ذہانت کا قائل۔ بہرحال ہر شخص کسی نہ کسی طرح ان سے متاثر ضرور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مولانا دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے تو ہندستانی سماج کے ہر طبقہ کے رہنماؤں نے اُن کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کیے جن سے مولانا کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا:

> "مولانا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور اس پر عمر بھر ایک چٹان کی طرح کھڑے رہے جب کہ ان کے ہم مذہبوں نے ان پر ناروا تنقید و تعریض کی بارش کی۔ مشکل مسائل کو حل کرنے کے لیے ان کی رائے ہمیشہ کام آتی تھی۔ ان سے زیادہ تو کیا ان کے برابر کی مدت تک بھی کوئی لگاتار کانگریس کا صدر نہیں رہا اور وہ بھی اس وقت جب نہایت نازک اور

ضروری مسائل پر غور وخوص ہوا۔ ان کے علم وفضل کے باب میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ صرف 'ترجمان القرآن' کا کام ہی ایسا ہے کہ وہ دنیا کے علماء میں ممتاز ہیں۔ ان کے جنازہ کے ساتھ لاکھوں عقیدت مند تھے یہ لوگوں کی ان سے محبت اور عزت کا ثبوت ہے۔"

مولانا کے رفیق خاص وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

"۔۔۔۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشوونما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انھوں نے قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا اور اس کی جدوجہد، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منتہائے مقصد کی تکمیل میں شریک رہے۔ وہ اس تحریک کا اہم جزو تھے اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جید عالم اور انفرادیت پسند رہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہندستانی عوام کے انبوہ کثیر میں یک وتنہا حیثیت کے مالک رہے اس طویل مدت میں انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی اس کی وجہ سے انھیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔"

جواہر لال نہرو نے مزید کہا:

"۔۔۔۔ اُن کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر بات تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندستان کی اس گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا ہے جسے بہت سے بیرونی دھاروں نے متاثر اور مالا مال کیا ہے۔۔۔۔ بعض اعتبار سے ان کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک

ایسے غیر معمولی فرد تھے جنھوں نے اس مقصد کو، جس کے لیے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا۔"

ممتاز ماہرِ تعلیم اور بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا:

"مولانا نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لیے، اس کی آزادی حاصل کرنے کے لیے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کے لیے صَرف کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندہ نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دیے جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔"

"میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ بتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت وہ ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے، جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے۔ مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام ان لوگوں کو سیکھنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ

وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کے تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اس دیس کا، پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے، تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے روشن طور پر ہمیں ملتا ہے . . ."

مولانا کے معتمد اور ان کی تصنیف "ہماری آزادی" India Wins Freedom کے کاتب پروفیسر ہمایوں کبیر کے خیال ہیں :

"مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک، قوم پروری، ترقی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے . . . بعض لوگ مصلح اور قوم پرور کی حیثیت سے ان کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندستانی مسلمانوں سے منسوب کر دیے ہیں۔ اسلام نے، جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے، جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردرانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ چنانچہ وہ ملک وقوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔"

کانگریس کے نامور رہنما جے۔ بی۔ کرپلانی کے الفاظ ہیں :

"مولانا کا خیال تھا کہ ہندستان کا آزاد ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کے

ساتھ دوسری نوآبادیوں اور اسلامی ملکوں کی آزادی بھی وابستہ ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اس تحریک میں ہندستانی عوام کا شامل ہونا ضروری ہے چنانچہ وہ ہمیشہ گاندھی جی کی قیادت اور ان کی عدم تشدد کی تحریک سے وابستہ رہے حالانکہ بعض اور ساتھیوں کی طرح عدم تشدد ان کا ایمان نہیں تھا لیکن کانگریس کی مقرر کردہ پالیسی کے ہمیشہ وفادار رہے۔ مصائب یا ملک میں دوسروں کا راہِ راست سے فرار انھیں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکا۔ ۔ ۔

" انصاف پسندی ان کا شعار رہا۔ وہ بڑے معقولیت پسند تھے۔ اختلاف ہوتا تو بے باکی سے اس کا اظہار بھی کرتے بلکہ کبھی کبھی تنبیہ بھی کر دیتے، ان کے جانے کے بعد سب یہ محسوس کرتے ہیں کہ میدانِ سیاست کا وہ فرد نہ رہا جس میں یہ ہمت تھی کہ ضرورت پڑے تو کسی کو منع بھی کر سکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا بڑے دینی عالم تھے۔ علم و فضل میں بے مثال تھے اردو میں ان کی خطابت کا جواب نہیں تھا۔ ملک کی بے پناہ محبت کے باوجود وہ ایک بین الاقوامی نظریے کے حامل تھے۔ جنگ آزادی میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں ان کی متوازن شخصیت، علمیت اور بصیرت ہمیشہ یاد رہے گی۔"

مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کی رائے ہے کہ:

" مولانا کا پیغام قوم کے لیے یہی تھا کہ نیکی اور شرافت کا ساتھ دو اور برائی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی رسّی کو جو حق اور صداقت کی رسّی ہے، جو سنیہ کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ اور خود انھوں نے عمر بھر کبھی اس حبل المتین کو، اس مضبوط رسّی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں 'اپنوں' کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی صحیح اور سچی بات میں 'غیروں' سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لیے 'اپنے' وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور 'غیر' وہ جو ان اصولوں کی مخالفت

کریں "

اردو کے مایۂ ناز ادیب اور ناقد پروفیسر آل احمد سرور نے مولانا کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کتنی سچی بات لکھی ہے کہ :

"اُس کی زندگی بڑی شاندار اور بھرپور تھی۔ اُس کی موت بھی بڑی باوقار اور جلیل ہوئی۔ وہ ملک و قوم کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر اس نے جان دی۔ شروع سے آخر تک وہ وضع دار رہا۔ ایمان اور عاشقی دونوں کو اُس نے سربلند کیا۔ جب تک وہ ہم میں موجود تھا تو ہمارے پاس کیا کچھ نہیں تھا اور اب جب کہ وہ ہم سے جدا ہو گیا ہے تو ہم نے کیا کیا نہیں کھو دیا ہے — !!"

ISBN :978-81-7587-470-1
9788175874701

₹ 52/-